سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ

سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّاثْنَتَانِ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّخَمْسُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ صافات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ایک سو بیاسی آیتیں ہیں اور پانچ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ① فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ② فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ③

قسم ہے صف باندھنے والوں کی قطار ہو کر، پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر، پھر پڑھنے والوں کی یاد کر کر،

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ④ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

بیشک حاکم تم سب کا ایک ہے۔ رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے

وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ⑤ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ٱلْكَوَاكِبِ ⑥

اور رب مشرقوں کا۔ ہم نے رونق دی ورلے آسمان کو ایک رونق جو تارے ہیں۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ⑦ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ

اور بچاؤ بنایا ہر شیطان سرکش سے۔ سن نہیں سکتے اوپر کی مجلس

الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ⑧ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ

تک اور پھینکے جاتے ہیں ان پر ہر طرف سے بھگانے کو اور ان پر مار ہے

وَّاصِبٌ ⑨ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ⑩

ہمیشہ کو، مگر جو کوئی اچک لایا جھپ سے پھر پیچھے لگا اس کے انگارا چمکتا۔

خُلاصۂ تفسیر

قسم ہے ان فرشتوں کی جو (عبادت میں یا حق تعالیٰ کا حکم سننے کے وقت) صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں (جیسا اسی سورت میں آگے آئے گا وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ) پھر (قسم ہے) ان فرشتوں کی جو (شہاب ثاقب کے ذریعہ آسمانی خبریں لانے سے شیاطین کی) بندش کرنے والے ہیں (جیسا کہ اسی سورت میں عنقریب آ رہا ہے) پھر (قسم ہے) ان فرشتوں کی جو ذکر (الٰہی تسبیح و تقدیس) کی تلاوت کرنے والے ہیں (جیسا کہ اسی سورت میں آئے گا، وَّاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ، غرض ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں) کہ تمہارا معبود (برحق) ایک ہے (اور اس توحید کی دلیل یہ ہے کہ) وہ پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے (یعنی ان کا مالک اور متصرف) اور پروردگار ہے (سب ستاروں کے) طلوع کرنے کے مواقع کا (اور) ہم ہی نے رونق دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ اور (انہی ستاروں کے ساتھ اس آسمان کی یعنی اس کی خبروں کی) حفاظت بھی کی ہے ہر شریر شیطان سے (جس کا طریقہ آگے بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی حفاظت کے انتظام کی وجہ سے) وہ شیاطین عالم بالا (یعنی ملائکہ) کی (باتوں کی) طرف کان بھی نہیں لگا سکتے (یعنی اکثر تو مار کھانے کے ڈر سے دور ہی دور رہتے ہیں) اور (اگر کبھی اتفاقاً اس کی کوشش کرتے بھی ہیں تو) وہ ہر طرف سے (یعنی جس طرف بھی جو شیطان جائے) مار کر دھکے دیدیئے جاتے ہیں (یہ عذاب اور ذلت تو انہیں فی الحال ملتی ہے) اور (پھر آخرت میں) ان کے لئے (جہنم کا) دائمی عذاب ہوگا (غرض کوئی آسمانی خبر سننے سے پہلے ہی انھیں مار بھگایا جاتا ہے، وہ سننے کا ارادہ لے کر آتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں) مگر جو شیطان کچھ خبر لے ہی بھاگے تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ لیتا ہے (کہ اس کو جلا کر پھونک دیتا ہے، لہٰذا جو کچھ سنتا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ تمام انتظامات و تصرفات توحید خداوندی پر دلالت کرتے ہیں)۔

مَعارف و مَسائل

سورت کے مضامین یہ سورت مکی ہے، اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی موضوع بھی ایمانیات ہیں اور اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں مشرکین کے عقائد کی تردید بھی ہے، اور آخرت میں جنت و دوزخ کے حالات کی منظر کشی بھی۔ جو عقائد تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں شامل رہے ان کو مدلل کرنے اور کفار کے شبہات و اعتراض کو دور کرنے کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ماضی میں

جن لوگوں نے ان عقائد کو تسلیم کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا رہا؟ اور جنھوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی ان کا کیا انجام ہوا؟ چنانچہ اس ضمن میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، اور ان کے صاحبزادگان، حضرت موسیٰ و ہارون، حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے واقعات کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں۔

مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، آخر میں اس عقیدے کی مفصل تردید کی گئی ہے۔ اور سورت کے مجموعی طرز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں شرک کی اس خاص قسم (یعنی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے) کی تردید بطور خاص پیش نظر رہی ہے۔ اسی لئے سورت کو فرشتوں کی قسم کھا کر ان کے اوصافِ بندگی کو ذکر کر کے شروع کیا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم،

پہلا مضمون توحید

سورت کو عقیدۂ توحید کے بیان سے شروع کیا گیا ہے، اور پہلی چار آیتوں کا اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ (بلاشبہ تمہارا معبود ایک ہی ہے) لیکن اس بات کو بیان کرنے سے پہلے تین قسمیں کھائی گئی ہیں۔ ان قسموں کا ٹھیٹھ لفظی ترجمہ یہ ہے:

"قسم صف باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی، پھر قسم بندش کرنیوالوں کی، پھر قسم ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی"

یہ "صف باندھ کر کھڑے ہونے والے"، "بندش کرنے والے" اور "ذکر کی تلاوت کرنے والے" کون ہیں؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس کی صراحت نہیں ہے، اس لئے اس کی تفسیر میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ان سے مراد اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے وہ غازی ہیں جو صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، تاکہ باطل کی قوتوں پر "بندش" لگائیں، اور صف آرا ہوتے وقت "ذکر" و "تسبیح اور تلاوتِ قرآن میں بھی مشغول رہتے ہیں۔

بعض نے کہا کہ ان سے مراد وہ نمازی ہیں جو مسجد میں صف باندھ کر شیطانی افکار و اعمال پر "بندش" عائد کرتے ہیں، اور اپنا پورا دھیان "ذکر و تلاوت" پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ (تفسیر کبیر و قرطبی) اور اس کے علاوہ بھی بعض تفسیریں بیان کی گئی ہیں، جو الفاظِ قرآن کے ساتھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتیں۔

لیکن جمہور مفسرین کے یہاں جس تفسیر کو سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل ہوا، وہ یہ ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں، اور یہاں ان کی تین صفات بیان کی گئی ہیں:

پہلی صفت اَلصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ہے۔ یہ لفظ "صفّ" سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں "کسی جمعیت کو ایک خط پر استوار کرنا" (قرطبی) لہٰذا اس کے معنی ہوئے "صف باندھ کر کھڑے ہونے والے"

فرشتوں کی صف بندی کا ذکر اسی سورت میں آگے چل کر بھی آیا ہے۔ فرشتے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ (یعنی بلاشبہ ہم سب صف باندھے کھڑے رہتے ہیں) یہ صف بندی کب ہوتی ہے؟ اس کے جواب میں بعض حضرات مفسرین مثلاً حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور قتادہؒ نے یہ فرمایا کہ فرشتے ہمیشہ فضا میں صف باندھے ـــــ اللہ کے حکم کے لئے گوش برآواز رہتے ہیں، اور جب کوئی حکم ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ (مظہری) اور بعض حضرات نے اُسے عبادت کے وقت کے ساتھ مخصوص کیا ہے، یعنی جب فرشتے عبادت اور ذکر و تسبیح میں مشغول ہوتے ہیں تو صف باندھ لیتے ہیں (تفسیر کبیر)

نظم و ضبط دین میں مطلوب ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر کام میں نظم و ضبط اور ترتیب و سلیقہ کا لحاظ رکھنا دین میں مطلوب اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو یا اس کے احکام کی تعمیل، یہ دونوں مقصد اس طرح بھی حاصل ہو سکتے تھے کہ فرشتے صف باندھنے کے بجائے ایک غیر منظم بھیڑ کی شکل میں جمع ہو جایا کریں، لیکن اس بدنظمی کے بجائے انھیں صف بندی کی توفیق دی گئی، اور اس آیت میں اُن کے اچھے اوصاف میں سب سے پہلے اسی وصف کو ذکر کر کے بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند ہے۔

نماز میں صفوف کی درستی اور اس کی اہمیت

چنانچہ انسانوں کو بھی عبادت کے دوران اس صف بندی کی ترغیب و تاکید کی گئی ہے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: "تم (نماز میں) اس طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور کرتے ہیں"؟ صحابہؓ نے پوچھا: "فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بندی کرتے ہیں"؟ آپ نے جواب دیا: "وہ صفوں کو پورا کرتے ہیں، اور صف میں پیوست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں (یعنی بیچ میں خالی جگہ نہیں چھوڑتے)"۔ (تفسیر مظہری)

نماز میں صفوں کو پورا کرنے اور سیدھا رکھنے کی تاکید میں اتنی احادیث وارد ہوئی ہیں کہ ان سے ایک پورا رسالہ بن سکتا ہے۔ حضرت ابو مسعود بدریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو ہاتھ لگا کر فرمایا کرتے تھے: "سیدھے رہو، آگے پیچھے مت ہو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا" (جمع الفوائد بحوالہ مسلم و نسائی ص ۹۲ ج ۱)

فرشتوں کی دوسری صفت فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا بیان کی گئی ہے۔ یہ لفظ "زجر" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں "روکنا"، "ڈانٹنا"، "پھٹکارنا"۔ حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ "بندش کرنے والے" سے کیا ہے، جو لفظ کے ہر ممکن مفہوم کو جامع ہے۔ فرشتے کس چیز پر بندش عائد کرتے ہیں؟ قرآن کریم کے سیاق کے پیش نظر زیادہ تر مفسرین نے اس کا

یہ جواب دیا ہے کہ یہاں "بندش عائد کرنے سے" مراد فرشتوں کا وہ عمل ہے جس کے ذریعہ وہ شیاطین کو عالمِ بالا تک پہنچنے سے روکتے ہیں، اور جس کا تفصیلی ذکر خود قرآن کریم میں آگے آرہا ہے۔

تیسری صفت فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ہے۔ یعنی یہ فرشتے "ذکر" کی تلاوت کرنے والے ہیں "ذکر" کا مفہوم "نصیحت کی بات" بھی ہو اور "یادِ خدا" بھی۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں کے ذریعہ جو نصیحت کی باتیں نازل کی ہیں یہ ان کی تلاوت کرنے والے ہیں۔ اور یہ تلاوت حصولِ برکت اور عبادت کے طور پر بھی ہو سکتی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے وحی لانے والے فرشتے مراد ہوں کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے سامنے ان کتب نصیحت کی تلاوت کرکے انھیں اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں جبکہ "ذکر" سے مراد یادِ خدا لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر دم اُن کلمات کی تلاوت میں مصروف رہتے ہیں، جو اللہ کی تسبیح و تقدیس پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے فرشتوں کی یہ تین صفات ذکر کرکے بندگی کے تمام اوصاف کو جمع کر دیا ہے۔ یعنی عبادت کے لئے صف بستہ رہنا، طاغوتی طاقتوں کو اللہ کی نافرمانی سے روکنا، اور اللہ کے احکام و مواعظ کو خود پڑھنا، اور دوسروں تک پہنچانا۔ اور ظاہر ہے۔ بندگی کا کوئی عمل ان تین شعبوں سے خالی نہیں ہو سکتا، لہٰذا چاروں آیتوں کا مفہوم یہ ہو گیا کہ "جو فرشتے تمام اوصافِ بندگی کے حامل ہیں ان کی قسم، تمھارا معبود برحق ایک ہی ہے"!

فرشتوں کی قسم کیوں کھائی گئی؟

اس سورت میں خاص طور پر فرشتوں کی قسم کھانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا — اس سورت کا مرکزی موضوع شرک کی اس خاص قسم کی تردید ہے جس کے تحت اہلِ مکہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ چنانچہ سورت کی ابتداء ہی میں فرشتوں کی قسم کھا کر ان کے وہ اوصاف بیان کر دیئے گئے جن سے ان کی مکمل بندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں کے ان اوصافِ بندگی پر غور کرو گے تو وہ خود تمھارے سامنے اس بات کی گواہی دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رشتہ باپ بیٹی کا نہیں، بلکہ بندہ و آقا کا ہے۔

حق تعالیٰ کا قسم کھانا اور اس کے متعلق احکام اور سوال و جواب

قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ایمان و عقائد کے بہت سے اصولی مسائل کی تاکید کے لئے مختلف طرح کی قسم کھائی ہے، کبھی اپنی ذات کی، کبھی اپنی مخلوقات میں سے خاص خاص اشیاء کی۔ اس کے متعلق بہت سے سوالات ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن شریف کی تفسیر میں یہ ایک مستقل اصولی مسئلہ بن گیا ہے۔ حافظ ابن قیمؒ نے اس پر ایک مستقل کتاب "التبیان فی اقسام القرآن" لکھی ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنی

اصولِ تفسیر کی کتاب "اتقان" میں مباحث کی سرسٹھویں نوع اس کو قرار دے کر مفصل کلام کیا ہے۔ یہاں کچھ ضروری اجزاء لکھے جاتے ہیں۔

پہلا سوال: اللہ تعالیٰ کی قسم کھانے میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ غنی الاغنیاء ہیں، ان کو کیا ضرورت ہے کہ کسی کو یقین دلانے کے لئے قسم کھائیں؟

اتقان میں ابوالقاسم قشیریؒ سے اس سوال کے جواب میں یہ مذکور ہے کہ حق تعالیٰ کو تو کوئی ضرورت قسم کھانے کی نہ تھی، مگر اس کو جو شفقت و رحمت اپنی مخلوق پر ہے وہ اس کی داعی ہوئی کہ کسی طرح یہ لوگ حق کو قبول کریں اور عذاب سے بچ جائیں۔ ایک اعرابی نے جب آیت وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ، سنی تو کہنے لگا کہ اللہ جیسے عظیم الشان ہستی کو کس نے ناراض کیا ہے کہ اس کو قسم کھانے پر مجبور کر دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ شفقت علی الخلق اس کی داعی ہے کہ جس طرح دنیا کے جھگڑے مچکانے اور اختلافات مٹانے کا معروف طریقہ یہ ہے کہ دعوے پر شہادت پیش کی جائے شہادت نہ ہو تو قسم کھائی جائے، اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کے اس مانوس طریقہ کو اختیار فرمایا ہے کہیں تو شہادت کے الفاظ سے مضمون کی تاکید فرمائی جیسے شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الآیۃ، اور کہیں قسم کے الفاظ سے جیسے إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ وغیرہ

دوسرا سوال یہ ہے کہ قسم اپنے سے بہت بڑے کی کھائی جاتی ہے، حق تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی قسم کھائی جو ہر حیثیت سے کمتر ہیں؟

جواب یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ سے بڑی کوئی ذات نہ ہو نہ ہو سکتی ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی قسم عام مخلوق کی قسم کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے کہیں اپنی ذات پاک کی قسم کھائی ہے جیسے (إِي وَرَبِّي)، اور اس طرح ذات حق کی قسمیں قرآن میں سات جگہ آئی ہیں۔ اور کہیں اپنے افعال و صفات کی اور قرآن کی قسم کھائی ہے، جیسے وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْأَرْضِ وَمَا طَحٰهَا وَنَفْسٍ وَمَا سَوّٰهَا وغیرہ، اور بیشتر قسمیں اپنے مفعول و مخلوق کی استعمال ہوئی ہیں، جو معرفت کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اسی کی ذات کی طرف راجع ہو جاتی ہیں۔ (کذا ذکرہ ابن قیم)

مخلوقات میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، کہیں تو اس سے اس چیز کو عظمت و فضیلت کا بیان کرنا مقصود ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آئی ہے لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ۝ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق اور کوئی چیز دنیا میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے زیادہ معزز و مکرم نہیں پیدا کی یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی نبی و رسول کی ذات کی قسم نہیں آئی، صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کی قسم آیت مذکورہ میں آئی ہے۔ اسی طرح (وَالطُّوْرِ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ) کی قسم بھی طور اور کتاب کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے آئی ہے۔

اور بعض اوقات کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ وہ کثیر المنافع ہے، جیسے وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ۔ اور بعض جگہ کسی مخلوق کی قسم اس لئے کھائی ہے کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا مظہر اور معرفت صانع عالم کا اہم ذریعہ ہے۔ اور عموماً جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس کو اس مضمون کے ثبوت میں کچھ دخل ضرور ہوتا ہے جس مضمون کے لئے قسم کھائی ہے، جو ہر جگہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ شریعت کا مشہور حکم عام انسانوں کے لئے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں، حق تعالیٰ کی طرف سے خود مخلوقات کی قسم کھانا کیا اس کی دلیل نہیں کہ دوسروں کے لئے بھی غیر اللہ کی قسم جائز ہے؟ اس کے جواب میں حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ يقسم بما شاء من خلقه وليس لاحد ان يقسم الا بالله (رواه ابن ابی حاتم۔ از مظہری)	"اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے وہ اپنی مخلوقات میں سے جس چیز کی چاہے قسم کھائے، مگر کسی دوسرے کے لئے اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں"

مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ جل شانہٗ پر قیاس کرنا غلط اور باطل ہے، جب شریعت الٰہیہ میں عام انسانوں کے لئے غیر اللہ کی قسم ممنوع کر دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے اپنے ذاتی فعل سے اس کے خلاف استدلال کرنا باطل ہے۔

اس کے بعد آیات مذکورہ کی تفسیر پر غور فرمایئے۔

پہلی چار آیتوں میں فرشتوں کی قسم کھا کر یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم سب کا معبود برحق ایک ہے۔ اگرچہ قسم کے دوران فرشتوں کی صفات بھی وہ ذکر کی گئی ہیں جن پر تھوڑا سا بھی غور کر لیا جائے تو وہ عقیدۂ توحید ہی کی دلیل معلوم ہوتی ہیں، لیکن آگے کی چند آیات میں توحید کی دلیل مستقلاً بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جتنی مخلوقات ہیں ان کا اور پروردگار ہے مشرقوں کا) تو

جو ذات اتنی عظیم مخلوقات کی خالق و پروردگار ہو، عبادت کی مستحق بھی وہی ہے، اور یہ ساری کائنات اس کے وجود اور وحدانیت کی دلیل ہے ———— یہاں اَلْمَشَارِق، مشرق کی جمع ہے، اور چونکہ سورج سال کے ہر دن میں ایک نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے اس کی مشرقیں بہت ساری ہیں، اسی بناء پر یہاں جمع کا صیغہ لایا گیا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ اس میں السماء الدنیا سے مراد نزدیک ترین آسمان ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس نزدیک والے آسمان کو ستاروں کے ذریعے زینت بخشی ہے، اب یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ ستارے ٹھیک آسمان کے اندر رہوں، بلکہ اگر اس سے جدا ہوں تب بھی زمین سے دیکھا جائے تو وہ آسمان ہی پر معلوم ہوتے ہیں، اور ان کی وجہ سے آسمان جگمگاتا نظر آتا ہے۔ بتلانا صرف اس قدر ہے کہ یہ تاروں بھرا آسمان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خود بخود وجود میں نہیں آ گیا، بلکہ اسے پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے، اور جو ذات اتنی عظیم الشان چیزوں کو وجود میں لا سکتی ہے اُسے کسی شریک اور ساجھی کی کیا ضرورت ہے؟ نیز جب یہ بات مشرکین کے نزدیک بھی طے شدہ ہے کہ ان تمام فلکی اجسام کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو یہ بڑے ظلم کی بات ہے کہ خالق و مالک تو وہ ہو اور عبادت کسی اور کی کی جائے؟

رہا یہ مسئلہ کہ ستارے قرآن کی رُو سے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں یا اس سے الگ ہیں؟ نیز قرآن کریم کا علم ہیئت کے ساتھ کیا ربط ہے؟ اس موضوع پر مفصل بحث سورۂ حجر میں گذر چکی ہے۔

وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (الیٰ قولہ تعالیٰ) فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ۔ ان آیات میں زینت و آرائش کے علاوہ ستاروں کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ شریر قسم کے شیاطین کو عالم بالا کی باتیں سننے سے روکا جاتا ہے۔ وہ غیبی خبروں کی سُن گُن لینے کے لئے آسمان کے قریب جاتے ہیں، لیکن انھیں فرشتوں کی باتیں سننے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ کوئی شیطان اگر کوئی آدھی ہتائی بات سُن بھاگتا ہے تو اُسے ایک دہکتے ہوئے شعلے کے ذریعے مار لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ دنیا میں پہنچ کر اپنے معتقد کاہنوں اور نجومیوں کو کچھ بتا نہ سکے، اسی دہکتے ہوئے شعلے کو "شہاب ثاقب" کہا گیا ہے۔

"شہاب ثاقب" کی کچھ تفصیل سورۂ حجر میں گذر چکی ہے، یہاں اتنی تنبیہ ضروری ہے کہ قدیم یونانی فلاسفہ اس بات کے قائل تھے کہ "شہاب ثاقب" دراصل کوئی زمینی مادہ ہوتا ہے، جو بخارات کے ساتھ اوپر چلا جاتا ہے، اور کرۂ نار کے قریب پہنچ کر جل اٹھتا ہے، لیکن قرآن کریم کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے "شہاب ثاقب" کوئی زمینی مادہ نہیں،

بلکہ عالم بالا ہی میں پیدا ہونے والی کوئی چیز ہے۔ قدیم مفسرین اس موقع پر یہ کہتے آئے ہیں کہ یونانی فلاسفہ کا یہ خیال" کہ شہاب ثاقب کوئی زمینی مادہ ہے محض قیاس اور تخمینہ پر مبنی ہے، اس لئے اس سے قرآن پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ اگر کوئی زمینی مادہ اوپر جاکر مشتعل ہوجاتا ہو تو قرآن کریم سے اس کی بھی کوئی منافات نہیں۔

لیکن آج کی جدید سائنسی تحقیقات نے یہ سوال ہی ختم کردیا ہے۔ موجودہ سائنسدانوں کا خیال یہ ہے کہ "شہاب ثاقب" اَن گنت ستاروں ہی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں، اور عموماً بڑی بڑی اینٹوں کے برابر اور یہ اَن گنت ٹکڑے فضا میں رہتے ہیں۔ انہی کا ایک مجموعہ "اسدیہ" کہلاتا ہے، جو سورج کے گرد ہلیلہ کی شکل میں گردش کرتا رہتا ہے، اور اس کا ایک دورہ ۳۳ سال میں پورا ہوتا ہے۔ ان ٹکڑوں میں روشنی ان کی تیز رفتاری اور خلائی اجرام کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ٹکڑے ۱۰ر اگست اور ۲۷ر نومبر کی راتوں میں زیادہ گرتے ہیں، اور ۲۰ر اپریل، ۲۸ر نومبر، ۱۸ر اکتوبر اور ۶ر، ۹ر، ۱۳ر دسمبر کی راتوں میں کم ہوجاتے ہیں۔

(از تفسیر الجواہر للطنطاوی، ص ۱۵، ج ۸)

جدید سائنس کی یہ تحقیق قرآنی اسلوب بیان کے زیادہ مطابق ہے، البتہ جو لوگ "شہاب ثاقب" کے ذریعہ شیطانوں کے مارے جانے کو بعید از قیاس سمجھتے ہیں ان کے بارے میں طنطاوی مرحوم نے الجواہر میں بڑی اچھی بات لکھی ہے:

"ہمارے آباء واجداد اور حکماء کو بھی یہ بات گراں محسوس ہوتی تھی کہ قرآن کریم ان کے زمانہ کے علم فلکیات کے خلاف کوئی بات کہے، لیکن مفسرین اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ ان کے فلسفیانہ نظریات کو قبول کرکے قرآن کو چھوڑ دیں، اس کے بجائے انھوں نے ان فلسفیانہ نظریات کو چھوڑا اور قرآن کے ساتھ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد خود بخود ثابت ہوگیا کہ قدیم یونانی فلاسفہ کا خیال بالکل باطل اور غلط تھا، اب بتایئے کہ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ ستارے شیطانوں کو جلاتے، مارتے اور تکلیف پہنچاتے ہیں تو اس میں کونسی رکاوٹ ہے؟ ہم قرآن کریم کے اس بیان کو تسلیم کرتے ہوئے مستقبل کے انتظار میں ہیں، (جب سائنس بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلے گی)۔ ——— (جواہر ص ۱۴ ج ۸)

مقصد اصلی یہاں آسمانوں، ستاروں، اور شہاب ثاقب کا تذکرہ کرنے سے ایک مقصد تو توحید کا اثبات ہے کہ جس ذات نے یکہ وتنہا اتنے زبردست آفاقی انتظامات کئے ہوئے ہیں، وہی لائق عبادت بھی ہے۔ دوسرے اسی دلیل میں اُن لوگوں کے خیال

کی تردید بھی کردی گئی ہے جو شیطانوں کو دیوتا یا معبود قرار دیتے ہیں، اور جتادیا گیا ہے کہ یہ تو ایک مردود ومقہور مخلوق ہیں، ان کو خدائی سے کیا واسطہ؟

اس کے علاوہ اسی مضمون میں اُن لوگوں کی بھی بھرپور تردید موجود ہے جو قرآن کریم کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کو کاہنوں کی کہانت سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ ان آیتوں میں اشارہ کردیا گیا کہ قرآن کریم تو کاہنوں کی تردید کرتا ہے، اسلئے کہ ان کی معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ شیاطین ہیں، اور قرآن یہ کہتا ہے کہ شیاطین کی عالم بالا تک رسائی ممکن نہیں، وہ غیب کی سچی خبریں نہیں لاسکتے۔ جب کہانت کے بارے میں قرآن کریم کا بیان کیا ہوا عقیدہ یہ ہے تو وہ خود کہانت کیسے ہوسکتا ہے؟ اس طرح یہ آیتیں توحید اور رسالت دونوں مضامین کی طرف اشاروں پر مشتمل ہیں، اور آگے انہی آسمانی مخلوقات کے ذریعہ آخرت کے عقیدے کو ثابت کیا گیا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَنْ خَلَقْنَا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ

اب پوچھ ان سے کیا یہ بنانے مشکل ہیں یا جتنی خلقت کہ ہم نے بنائی؟ ہم نے ہی ان کو بنایا ہے

مِنْ طِينٍ لَازِبٍ ﴿١١﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ﴿١٢﴾ وَإِذَا ذُكِّرُوا

ایک چپکتے گارے سے۔ بلکہ تو کرتا ہے تعجب اور وہ کرتے ہیں ٹھٹھے۔ اور جب انکو سمجھایئے

لَا يَذْكُرُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ﴿١٤﴾ وَقَالُوا

نہیں سوچتے۔ اور جب دیکھیں کچھ نشانی ہنسی میں ڈال دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں

إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿١٥﴾ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَ

کچھ نہیں یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا جب ہم مرگئے اور ہوگئے مٹی اور

عِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿١٦﴾ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿١٧﴾ قُلْ

ہڈیاں تو کیا ہم کو پھر اٹھائیں گے، کیا اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی؟ تو کہہ کہ

نَعَمْ وَأَنْتُمْ دَاخِرُونَ ﴿١٨﴾

ہاں اور تم ذلیل ہوگے۔

خلاصۂ تفسیر

(جب دلائل توحید سے معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ ان عظیم الشان مخلوقات میں اکیلے

عظیم تصرّفات پر قادر ہیں اور یہ ساری عظیم مخلوقات اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں) تو آپ ان (آخرت کا انکار کرنے والوں) سے پوچھئے کہ یہ لوگ بناوٹ میں زیادہ سخت ہیں، یا ہماری پیدا کی ہوئی یہ چیزیں (جن کا ابھی ذکر ہوا؟ حقیقت یہی ہے کہ یہی چیزیں زیادہ سخت ہیں، کیونکہ) ہم نے ان لوگوں کو (تو آدمؑ کی تخلیق کے وقت اسی معمولی) چپچپی مٹی سے پیدا کیا ہے، (جس میں نہ کچھ قوت ہے نہ سختی، اور انسان جو اس سے بنا ہے وہ بھی زیادہ قوی اور سخت نہیں ہے) اب سوچنے کی بات ہے کہ جب ہم ایسی قوی اور سخت مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہیں تو انسان جیسی ضعیف مخلوق کو ایک بار موت دے کر دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قدرت نہ ہوگی؟ مگر ایسی واضح دلیل کے باوجود یہ لوگ آخرت کے امکان کے قائل نہیں ہوئے، بلکہ (اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ) آپ تو (ان کے انکار سے) تعجب کرتے ہیں اور یہ لوگ (انکار سے بڑھ کر آخرت کے عقیدے سے) تمسخر کرتے ہیں اور جب اُن کو (دلائلِ عقلیہ سے) سمجھایا جاتا ہے تو یہ سمجھتے نہیں اور جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں (جو آپؐ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو دکھایا جاتا ہے جس سے عقیدۂ آخرت ثابت کیا جاتا ہے) تو (خود) اس کی ہنسی اڑاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ (کیونکہ اگر یہ معجزہ ہو تو اس سے آپ کی نبوت ثابت ہو جائیگی اور آپ کو نبی ماننے کے بعد آپ کا بیان کردہ عقیدۂ آخرت بھی ماننا پڑے گا، حالانکہ ہم آخرت کا عقیدہ نہیں مان سکتے، کیونکہ) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے، تو کیا ہم (پھر) زندہ کئے جائیں گے، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے) آپ کہہ دیجئے کہ ہاں (ضرور زندہ ہوں گے) اور تم ذلیل بھی ہو گے۔

معارف و مسائل

عقیدۂ توحید کو ثابت کرنے کے بعد ان آٹھ آیتوں میں عقیدۂ آخرت کا بیان ہے، اور اس سے متعلق مشرکین کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلی آیت میں انسانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکان پر عقلی دلیل پیش کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کے جن عظیم اجسام کا ذکر پچھلی آیتوں میں کیا گیا ہے، انسان تو ان کے مقابلہ میں بہت کمزور مخلوق ہے جب تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے، چاند، ستارے، سورج اور شہاب ثاقب جیسی مخلوقات اپنی قدرت سے پیدا فرمائی ہیں، تو اس کے لئے انسان جیسی کمزور مخلوق کو موت دے کر دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے؟ جس طرح تمہیں ابتداء میں چپچپی ہوئی مٹی سے بنا کر تم میں روح پھونک دی تھی، اسی طرح جب تم مر کر دوبارہ خاک ہو جاؤ گے اُس وقت پھر اللہ تعالیٰ

تمہیں زندگی عطا کر دے گا۔

اور یہ جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے انھیں چپکتی مٹی سے پیدا کیا" اس سے مطلب یا تو یہ ہے کہ ان کے جدِّ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد ہر انسان ہو۔ اس لئے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر انسان کی اصل پانی ملی ہوئی مٹی ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ انسان نطفہ سے پیدا ہوتا ہے، نطفہ خون سے بنتا ہے، خون غذا سے پیدا ہوتا ہے اور غذا خواہ کسی شکل میں ہو اس کی اصل نباتات ہیں، اور نباتات مٹی اور پانی سے پیدا ہوتے ہیں۔

بہرصورت پہلی آیت عقیدۂ آخرت کی عقلی دلیل پر مشتمل ہے، اور اسے خود انہی سے یہ سوال کر کے شروع کیا گیا ہے کہ تم زیادہ سخت مخلوق ہو یا جن مخلوقات کا ذکر ہم نے کیا ہے، وہ زیادہ سخت ہیں؟ جواب ظاہر تھا کہ وہی مخلوقات زیادہ سخت ہیں، اس لئے اس کی تصریح کرنے کے بجائے اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ "ہم نے تو انہیں چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے"۔

اس کے بعد کی پانچ آیتوں میں اس ردِّ عمل کا بیان کیا گیا ہے جو آخرت کے دلائل سنکر مشرکین ظاہر کرتے ہیں۔ مشرکین کے سامنے عقیدۂ آخرت کے جو دلائل بیان کئے جاتے تھے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک تو عقلی دلائل، جیسے پہلی آیت میں بیان کیا گیا، دوسرے نقلی دلائل یعنی ان کو معجزے دکھا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا بیان کیا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، نبی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، اس کے پاس آسمانی خبریں آتی ہیں، جب آپ یہ خبر دے رہے ہیں کہ قیامت آئے گی، حشر و نشر ہوگا، انسانوں سے حساب کتاب لیا جائے گا تو یہ خبر یقیناً سچی ہے، اسے مان لینا چاہئے ـــــ جہاں تک عقلی دلائل پر مشرکین کے ردِّ عمل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ارشاد ہے:

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۝ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝ یعنی آپ کو تو ان لوگوں پر یہ تعجب ہوتا ہے کہ کیسے واضح دلائل سامنے آنے کے باوجود یہ لوگ نہیں مان رہے، لیکن یہ اُلٹا آپ کے دلائل و عقائد کا مذاق اڑاتے ہیں، اور انھیں کتنا ہی سمجھاؤ سمجھ کر نہیں دیتے۔

رہے نقلی دلائل، سو اس کے بارے میں ان کا ردِّ عمل یہ ہے کہ:

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝ یعنی جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں جو آپ کی نبوت اور بالآخر عقیدۂ آخرت پر دلالت کرتا ہے، تو یہ اُسے بھی ٹھٹھوں میں اڑا کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ اور اس سارے تمسخر و استہزاء کی اُن کے پاس ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ:

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝

یعنی یہ بات ہمارے تصور میں نہیں آتی کہ ہم یا ہمارے آباء واجداد خاک ہوجانے اور ہڈیاں بن جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ کردیئے جائیں گے؟ اس لئے ہم نہ کوئی عقلی دلیل مانتے ہیں، اور نہ کسی معجزے وغیرہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے اس کے جواب میں صرف ایک جملہ آخر میں ارشاد فرمایا۔ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝ "یعنی آپ کہہ دیجئے کہ ہاں تم ضرور دوبارہ زندہ ہوگے اور ذلیل وخوار ہوکر زندہ ہوگے"۔

دیکھنے میں تو یہ ایک حاکمانہ جواب ہے، جیسا ہٹ دھرمی کرنے والوں کو دیا جاتا ہے، لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ ایک پوری دلیل بھی ہے، جس کی تشریح امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں کی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اوپر دوبارہ زندہ ہونے کی عقلی دلیل سے ثابت ہوچکا ہے کہ انسانوں کا مرکر پھر زندہ ہونا کوئی ناممکن بات نہیں، اور یہ قاعدہ ہے کہ جو بات عقلاً ممکن ہو اس کا واقعۃً وجود میں آجانا کسی سچے خبر دینے والے کی خبر سے ثابت ہوسکتا ہے۔ جب یہ بات طے ہوگئی کہ دوبارہ زندہ ہونا ممکن ہے تو اس کے بعد کسی سچے نبی کا صرف اتنا کہہ دینا کہ "ہاں تم ضرور دوبارہ زندہ ہوگے" اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ثبوت

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً الخ میں "آیۃ" کے لغوی معنی نشانی کے ہیں، اور اس سے یہاں مراد معجزہ ہے۔ لہٰذا یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے علاوہ بھی کچھ معجزات عطا فرمائے تھے، اور اس سے اُن ملحدین کی تردید ہوجاتی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو حسی اسباب کے تابع قرار دے کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ کے دستِ مبارک پر قرآن کریم کے سوا کوئی معجزہ ظاہر نہیں کیا گیا۔

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا ہے، وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ (جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو اس کا ٹھٹھا اڑاتے ہیں) بعض منکرین معجزات کہتے ہیں کہ یہاں "آیۃ" سے مراد معجزہ نہیں، بلکہ عقلی دلائل ہیں۔ لیکن یہ بات اس لئے غلط ہے کہ اگلی آیت میں ہے وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ، یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے"۔ ظاہر ہے کہ کسی دلیل کو کھلا جادو قرار دینے کا کوئی تُک نہیں ہے، یہ بات وہ معجزہ دیکھ کر ہی کہہ سکتے ہیں۔

بعض منکرین معجزات یہ بھی کہتے ہیں کہ "آیۃ" سے مراد قرآن کریم کی آیات ہیں کہ یہ لوگ انھیں جادو قرار دیتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا لفظ "رَاَوْا" (دیکھتے ہیں) اس کی صاف

تردید کررہا ہے۔ آیاتِ قرآنی کو دیکھا نہیں، سُنا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں کہیں آیاتِ قرآنی کا ذکر ہے وہاں اس کے ساتھ سننے کے الفاظ آئے ہیں دیکھنے کے نہیں، اور قرآن کریم میں جگہ جگہ "آیۃ" کا لفظ معجزہ کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا مطالبہ نقل کرتے ہوئے ارشاد ہے:

"اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝"

"اگر تم کوئی معجزہ لے کر آئے ہو تو لاؤ، اگر سچے ہو"

اسی کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی کو سانپ بنانے کا معجزہ دکھلایا تھا۔

رہیں قرآن کریم کی وہ آیات جن میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ دکھانے کے مطالبہ کو نہیں مانا۔ سو درحقیقت وہاں بار بار معجزات دکھائے جاچکے تھے لیکن وہ ہر روز اپنی مرضی کا ایک نیا معجزہ طلب کرتے تھے، اس کے جواب میں معجزہ دکھانے سے انکار کیا گیا۔ اس لئے کہ اللہ کا نبی اللہ کے حکم سے معجزات دکھاتا ہے، اگر کوئی پھر بھی اس کی بات نہ مانے تو ہر روز ایک نیا معجزہ ظاہر کرنا نبی کے وقار کے بھی خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بھی۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا دستور یہ رہا ہے کہ جب کسی قوم کو اس کا مطلوبہ معجزہ عطا کردیا گیا اور اس کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائی، تو عذابِ عام کے ذریعہ اس کو ہلاک کیا گیا امتِ محمدیہ کو چونکہ باقی رکھنا اور عذابِ عام سے بچانا پیشِ نظر تھا اس لئے اسے مطلوبہ معجزہ نہیں دکھایا گیا۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝١٩ وَقَالُوْا

سو وہ اٹھانا تو یہی ہے ایک جھڑکی پھر اسی وقت یہ لگیں گے دیکھنے۔ اور کہیں گے

يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝٢٠ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ

اے خرابی ہماری یہ آگیا دن جزا کا۔ یہ ہے دن فیصلہ کا جس کو

كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝٢١ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ

تم جھٹلاتے تھے۔ جمع کرو گنہگاروں کو اور ان کے جوڑوں کو

وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٢٢﴾ مِن دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ

اور جو کچھ پوجتے تھے ، اللہ کے سوائے پھر چلاؤ ان کو

صِرَاطِ الْجَحِيمِ ﴿٢٣﴾ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ

دوزخ کی راہ پر ، اور کھڑا رکھو ان کو ، ان سے پوچھنا ہے ، کیا ہوا تم کو

لَا تَنَاصَرُونَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ ﴿٢٦﴾

ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ؟ کوئی نہیں وہ آج اپنے آپ کو پکڑوا دیتے ہیں ۔

خُلاصۂ تفسیر

پس قیامت تو بس ایک للکار ہوگی (یعنی دوسرا صور) سو (اس سے) سب یکایک (زندہ ہو کر) دیکھنے بھالنے لگیں گے اور (حسرت سے) کہیں گے ہائے ہماری کم بختی یہ تو وہی روزِ جزا (معلوم ہوتا) ہے (ارشاد ہوگا کہ ہاں) یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (آگے قیامت ہی کے بعض واقعات کی تفصیل ہے کہ فرشتوں کو حکم ہوگا) جمع کرو ظالموں کو (یعنی جو کفر و شرک کے بانی اور مقتدا تھے) اور ان کے ہم مشربوں کو (یعنی جو اُن کے ساتھ تابع تھے) اور ان معبودوں کو جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (یعنی شیاطین اور بُت) پھر ان سب کو دوزخ کا راستہ بتلاؤ (یعنی ادھر لے جاؤ) اور (پھر یہ حکم ہوگا کہ اچھا) ان کو (ذرا) ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا (چنانچہ اُن سے یہ سوال ہوگا) کہ اب تم کو کیا ہوا کہ (عذاب کا حکم سن کر) ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے (یعنی کافروں کے بڑے بڑے رہنما انسان ہوں یا شیاطین اپنے تابعین کی مدد نہیں کرتے، جس طرح دنیا میں ان کو بہکایا کرتے تھے ؟ مگر اس سوال کے بعد بھی وہ مدد نہ کر سکیں گے) بلکہ وہ سب کے سب اس روز سرافگندہ (کھڑے) ہوں گے ۔

معارف و مسائل

آخرت کے امکان و ثبوت کے بعد باری تعالیٰ نے ان آیتوں میں حشر و نشر کے کچھ واقعات بیان فرمائے ہیں، اور دوبارہ زندہ ہونے کے بعد کافروں اور مسلمانوں کو جو حالات پیش آئیں گے ان کا تذکرہ فرمایا ہے ۔

سب سے پہلی آیت میں مردوں کے زندہ ہونے کا طریقہ کار بیان فرمایا ہے کہ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ (یعنی قیامت تو بس ایک للکار ہوگی) زَجْرَةٌ کا لفظ زَجْرٌ کا اسم مرّہ ہے اور اس کے عربی زبان میں کئی معنی آتے ہیں ۔ ان میں سے ایک معنی ہیں "مویشیوں کو چلنے پر آمادہ کرنے کے لئے ایسی آواز میں نکالنا جنھیں سن کر وہ اُٹھ کھڑے ہوں" یہاں اس سے مراد وہ دوسرا صور ہے جو حضرت اسرافیل علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے پھونکیں گے، اور اسے "زجرۃ" سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ جس طرح مویشیوں کو اٹھا کر چلانے کے لئے کچھ آوازیں نکالی جاتی ہیں اسی طرح مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے یہ صور پھونکا جائے گا۔ (تفسیر قرطبی)

اگرچہ باری تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ صور پھونکے بغیر مُردوں کو زندہ کر دے، لیکن یہ صور حشر و نشر کے منظر کو پُر ہیبت بنانے کے لئے پھونکا جائے گا (تفسیر کبیر) ——— اس صور پھونکنے کا اثر کافروں پر یہ ہوگا کہ فَإِذَا هُمْ يَنظُرُونَ (پس اچانک وہ دیکھنے بھالنے لگیں گے) یعنی جس طرح دنیا میں وہ دیکھنے پر قادر تھے اسی طرح وہاں بھی دیکھ سکیں گے، اور بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے ۔ (قرطبی)

احْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ (یعنی ان ظالموں کو جنھوں نے شرک کے ظلم عظیم کا ارتکاب کیا اور ان کے ہم مشربوں کو جمع کرلو) یہاں ہم مشربوں کے لئے ازواج کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی ہیں "جوڑ" اور یہ لفظ شوہر اور بیوی کے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے ۔ اسی لئے بعض مفسرین نے اس کے معنی بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہو کہ اس سے مشرکین کی وہ بیویاں مراد ہیں جو خود بھی مشرک تھیں ۔ لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں "ازواج" سے مراد ہم مشرب ہی ہے، اور اس کی تائید حضرت عمرؓ کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے ۔ امام بیہقیؒ اور عبدالرزاقؒ وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ یہاں أَزْوَاجَهُمْ سے مراد ہیں ان جیسے دوسرے لوگ، چنانچہ سود خور دوسرے سود خوروں کے ساتھ، زناکار دوسرے زانیوں کے ساتھ، اور شراب پینے والے دوسرے شراب پینے والوں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے ۔ (روح المعانی و مظہری)

اس کے علاوہ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ کے الفاظ سے بتادیا گیا کہ مشرکین کے ساتھ ان کے وہ باطل معبود یعنی بُت اور شیاطین بھی جمع کئے جائیں گے جنھیں یہ لوگ دنیا میں اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، تاکہ اُس وقت اُن باطل معبودوں کی بے بسی کا اچھی طرح نظارہ کرایا جائے ۔

اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوگا کہ فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ یعنی ان لوگوں کو جہنم کا رستہ دکھلاؤ، اور جب فرشتے ان لوگوں کو لے چلیں گے تو پل صراط کے قریب پہنچنے کے بعد حکم ہوگا کہ وَقِفُوهُمْ إِنَّهُم مَّسْئُولُونَ، ان کو ٹھہراؤ، ان سے سوال ہوگا۔ چنانچہ اس مقام پر ان سے ان کے عقائد و اعمال کے بارے میں وہ سوالات کئے جائیں گے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٧﴾ قَالُوا إِنَّكُمْ كُنتُمْ
اور منہ کیا بعضوں نے بعضوں کی طرف لگے پوچھنے، بولے تم ہی تھے کہ آتے تھے ہم پر داہنی
تَأْتُونَنَا عَنِ الْيَمِينِ ﴿٢٨﴾ قَالُوا بَل لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٢٩﴾ وَمَا
طرف سے۔ وہ بولے کوئی نہیں پر تم ہی نہ تھے یقین والے۔ اور ہمارا
كَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ ۖ بَلْ كُنتُمْ قَوْمًا طَاغِينَ ﴿٣٠﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا
تم پر کچھ زور نہ تھا، پر تم ہی تھے لوگ حد سے نکل چلنے والے۔ سو ثابت ہوگئی ہم پر
قَوْلُ رَبِّنَا ۖ إِنَّا لَذَائِقُونَ ﴿٣١﴾ فَأَغْوَيْنَاكُمْ إِنَّا كُنَّا غَاوِينَ ﴿٣٢﴾
بات ہمارے رب کی بیشک ہم کو مزہ چکھنا ہے، ہم نے تم کو گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ تھے۔
فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿٣٣﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ
سو وہ سب اس دن تکلیف میں شریک ہیں۔ ہم ایسا ہی کرتے ہیں گنہگاروں
بِالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ
کے حق میں۔ وہ تھے کہ ان سے جب کوئی کہتا کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے،
يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٣٥﴾ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿٣٦﴾
تو غرور کرتے، اور کہتے کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے معبودوں کو کہنے سے ایک شاعر دیوانے کے؟
بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّكُمْ لَذَائِقُو الْعَذَابِ
کوئی نہیں، وہ لیکر آیا ہے سچا دین اور سچا مانتا ہے سب رسولوں کو، بیشک تم کو چکھنا ہے عذاب
الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾
دردناک۔ اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے۔

خلاصۂ تفسیر

(بجائے اس کے کہ مشرکین ایک دوسرے کی مدد کر سکیں ان میں اس وقت اُلٹا جھگڑا ہوگا) اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر جواب سوال (یعنی اختلاف) کرنے لگیں گے (چنانچہ تابعین اپنے سرداروں سے) کہیں گے کہ (ہم کو تو تم نے گمراہ کیا کیونکہ) ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہوا کرتی تھی (یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، متبوعین یہ) کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم خود ہی ایمان نہیں لائے تھے، اور (ہم پر ناحق الزام لگاتے ہو کیونکہ) ہمارا تم پر کوئی زور تو تھا ہی نہیں، بلکہ تم خود ہی سرکشی کیا کرتے تھے سو (جب کفر کے مرتکب ہم بھی تھے اور تم بھی، تو معلوم ہوا کہ) ہم سب ہی پر ہمارے رب کی یہ (ازلی) بات محقق ہو چکی تھی کہ ہم سب کو (عذاب کا) مزہ چکھنا ہے، تو (اس کا سامان یہ ہو گیا کہ) ہم نے تم کو بہکایا (جس سے تم ہمارے جبر و اکراہ کے بغیر خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے اور ادھر) ہم خود بھی (اپنے اختیار سے) گمراہ تھے (پس دونوں کی گمراہی کے اسباب جمع ہو گئے، جس میں تمہارا اپنا اختیار بھی اپنی گمراہی کا بڑا سبب ہے، پھر اپنے آپ کو بری کیسے کرنا چاہتے ہو! آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب دونوں فریق کا کفر میں مشترک ہونا ثابت ہے،) تو وہ سب کے سب اس روز عذاب میں (بھی) شریک رہیں گے (اور) ہم ایسے مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں (آگے ان کے کفر و جرم کا بیان ہے کہ) وہ لوگ ایسے تھے کہ (توحید کے بھی منکر تھے اور رسالت کے بھی چنانچہ) جب ان سے (بواسطہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تو (اس کے ماننے سے) تکبر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ (کے کہنے) کی وجہ سے چھوڑ دیں گے؟ (پس اس میں توحید اور رسالت دونوں کا انکار ہو گیا، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ پیغمبر نہ شاعر ہیں نہ مجنون) بلکہ (پیغمبر ہیں کہ) ایک سچا دین لے کر آئے ہیں اور (اصول توحید وغیرہ میں) دوسرے پیغمبروں کی تصدیق (اور موافقت) کرتے ہیں (یعنی ایسے اصول بتلاتے ہیں جس میں سب رسول متفق ہیں۔ پس وہ اصول بے شمار دلائل کی روشنی میں حق ہیں، خیال بندی نہیں، اور حق بات کا کہنا جنون نہیں۔ دوسری امتوں نے بھی اپنے انبیاء کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ یہاں چونکہ براہ راست کفار عرب مخاطب ہیں، اس لئے صرف اسی اُمت کے کفر کا ذکر کیا گیا ہے، آگے اس بات کا بیان ہے کہ انہیں مشافہۃً اس مشترک عذاب کی وعید سنائی جائے گی کہ) تم سب (تابع اور متبوع) کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا اور (اس حکم میں تم پر کوئی ظلم نہیں ہوا کیونکہ) تم کو اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم

دکفر وغیرہ اکیا کرتے تھے، ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے بندے ہیں (اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنھوں نے حق کا اتباع کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں مقبول اور مخصوص فرمالیا ایسے لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے)۔

معارف و مسائل

میدانِ حشر میں جمع ہونے کے بعد کافروں کے بڑے بڑے سردار جنھوں نے انھیں چھوٹوں کو بہکایا تھا، اپنے پیروؤں کے سامنے آئیں گے تو بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کی کوئی مدد کر سکیں، آپس میں بحث و تکرار شروع کر دیں گے۔ ان آیات میں اسی بحث و تکرار کا کچھ نقشہ کھینچ کر فریقین کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصۂ تفسیر سے واضح ہے، صرف چند مختصر باتیں قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَأْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ میں "یمین" کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک معنی قوت و طاقت بھی ہیں، اور اسی معنی کے لحاظ سے تفسیر یہ کی گئی ہے کہ "ہم پر تمھاری آمد بڑے زور کی ہوا کرتی تھی" یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کیا کرتے تھے اور یہی تفسیر زیادہ صاف اور بے غبار ہے۔ اس کے علاوہ یمین کے معنی قسم کے بھی آتے ہیں اس لئے بعض حضرات نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ: "تم ہمارے پاس قسمیں لے کر آیا کرتے تھے" یعنی قسم کھا کھا کر ہم پر یہ باور کراتے تھے کہ ہمارا مذہب درست ہے، اور رسول کی تعلیم (معاذ اللہ) باطل ہے۔ الفاظِ قرآنی کے لحاظ سے یہ دونوں تفسیریں بے تکلف ممکن ہیں۔

(۲) فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو ناجائز کام کی دعوت دے اور اسے گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے تو اسے دعوتِ گناہ کا عذاب تو بے شک ہوگا، لیکن جس شخص نے اس کی دعوت کو اپنے اختیار سے قبول کر لیا، وہ بھی اپنے عمل کے گناہ سے بری نہیں ہو سکتا۔ وہ آخرت میں یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں پا سکتا کہ مجھے تو فلاں شخص نے گمراہ کیا تھا، ہاں اگر اس نے گناہ کا ارتکاب اپنے اختیار سے نہ کیا ہو بلکہ جبر و اکراہ کی حالت میں اپنی جان بچانے کے لئے کر لیا ہو تو ان شاء اللہ اس کی معافی کی امید ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ
وہ لوگ جو ہیں اُن کے واسطے روزی ہے مقرر میوے اور ان کی عزت ہے نعمت کے

النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ
باغوں میں، تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے، لوگ لئے پھرتے ہیں ان کے پاس پیالہ
مِنْ مَعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا
شراب صاف کا، سفید رنگ مزہ دینے والی پینے والوں کو، نہ اُس میں سر پھرتا ہے اور نہ وہ
هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ ﴿٤٧﴾ وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ﴿٤٨﴾
اس کو پی کر بہکیں، اور اُن کے پاس ہیں عورتیں نیچی نگاہ رکھنے والیاں بڑی آنکھوں والیاں،
كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَكْنُونٌ ﴿٤٩﴾ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٥٠﴾
گویا وہ انڈے ہیں چھپے دھرے۔ پھر منہ کیا ایک نے دوسرے کی طرف لگے پوچھنے،
قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ﴿٥١﴾ يَقُولُ أَإِنَّكَ لَمِنَ
بولا ایک بولنے والا اُن میں میرا تھا ایک ساتھی، کہا کرتا کیا تو یقین
الْمُصَدِّقِينَ ﴿٥٢﴾ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا
کرتا ہے، کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو
لَمَدِينُونَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ أَنْتُمْ مُطَّلِعُونَ ﴿٥٤﴾ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي
جزاء ملے گی؟ کہنے لگا بھلا تم جھانک کر دیکھو گے؟ پھر جھانکا تو اس کو دیکھا
سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ تَاللَّهِ إِنْ كِدْتَ لَتُرْدِينِ ﴿٥٦﴾ وَلَوْلَا
بیچوں بیچ دوزخ کے۔ بولا قسم اللہ کی تو تو مجھ کو ڈالنے لگا تھا گڑھے میں، اور اگر نہ ہوتا
نِعْمَةُ رَبِّي لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ﴿٥٧﴾ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ﴿٥٨﴾
میرے رب کا فضل تو میں بھی ہوتا انہی میں جو پکڑے ہوئے آئے۔ کیا اب ہم کو مرنا نہیں،
إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴿٥٩﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ
مگر جو پہلی بار مر چکے اور ہم کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بیشک یہی ہے
الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ﴿٦١﴾
بڑی مراد ملنی۔ ایسی چیزوں کے واسطے چاہئے محنت کریں محنت کرنے والے۔

خلاصۂ تفسیر

ان (اللہ کے مقبول بندوں) کے واسطے ایسی غذائیں ہیں جن کا حال (دوسری سورتوں میں) معلوم (ہو چکا) ہے یعنی میوے (جن کا ملنا سورۂ یٰسٓ آیت لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ میں اور جن کی صفات سورۂ واقعہ آیت وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ میں اس کے قبل نازل ہو چکی ہیں، کیونکہ یٰسٓ اور واقعہ سورۂ صٰفّٰت سے نزول میں مقدم ہیں۔ کذا فی الاتقان) اور وہ لوگ بڑی عزت سے آرام کے باغوں میں تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہونگے (اور) اُن کے پاس ایسا جام شراب لایا جائے گا (یعنی غلمان لائیں گے) جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا (اس سے شراب کی کثرت اور لطافت معلوم ہوئی اور دیکھنے میں) سفید ہوگی (اور پینے میں) پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی (اور) نہ اس میں دردِ سر ہوگا (جیسے دنیا کی شراب میں ہوتا ہے جس کو خمار کہتے ہیں) اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا، اور ان کے پاس نیچی نگاہ والی بڑی بڑی آنکھوں والی (حوریں) ہوں گی (جن کی رنگت ایسی صاف ہوگی کہ) گویا ہیضے ہیں جو (پروں کے نیچے) چھپے ہوئے ہیں (کہ گرد و غبار اور داغ سے بالکل محفوظ ہوتے ہیں، تشبیہ محض صفائی میں ہے) پھر (جب سب لوگ ایک جلسہ میں جمع ہوں گے تو) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اس باتچیت کے دوران میں) ان (اہلِ جنت) میں سے ایک کہنے والا (اہلِ مجلس سے) کہے گا کہ (دنیا میں) میرا ایک ملاقاتی تھا وہ (مجھ سے بطور تعجب) کہا کرتا تھا کہ کیا تو بعث کے معتقدین میں سے ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا ہم (دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور زندہ کر کے) جزا سزا دیئے جائیں گے؟ (یعنی وہ آخرت کا منکر تھا، اس لئے ضرور وہ دوزخ میں گیا ہوگا۔ حق تعالیٰ کا) ارشاد ہوگا کہ (اے اہلِ جنت) کیا تم جھانک کر (اس کو) دیکھنا چاہتے ہو؟ (اگر چاہو تو تم کو اجازت ہے) سو وہ شخص (جس نے قصہ بیان کیا تھا) جھانکے گا تو اس کو وسطِ جہنم میں (پڑا ہوا) دیکھے گا (اس کو وہاں دیکھ کر اس سے) کہے گا کہ خدا کی قسم تُو تو مجھ کو تباہ ہی کرنے کو تھا (یعنی مجھ کو بھی منکرِ آخرت بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا) اور اگر میرے رب کا (مجھ پر) فضل نہ ہوتا (کہ مجھ کو اس نے صحیح عقیدے پر قائم رکھا) تو میں بھی (تیری طرح) ماخوذ لوگوں میں ہوتا (اور اس کے بعد جنتی اہلِ مجلس سے) کہے گا کہ) کیا ہم بجز پہلی بار مر چکنے کے (کہ دنیا میں مر چکے ہیں) اب نہیں مریں گے اور نہ ہم کو عذاب ہوگا؟ (یہ ساری باتیں اس جوشِ مسرت میں کہی جائیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے سب آفات اور کلفتوں سے بچا لیا اور ہمیشہ کے لئے بے فکر کر دیا۔ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنت کی جتنی جسمانی اور روحانی نعمتیں اوپر بیان کی گئیں) یہ بیشک بڑی کامیابی ہے، ایسی ہی کامیابی

(حاصل کرنے) کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے (یعنی ایمان لانا اور اطاعت کرنا چاہئے)۔

معارف و مسائل

اہلِ دوزخ کے حالات بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اہلِ جنت کے احوال کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ تذکرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں عام اہلِ جنت کو جو عیش و آرام حاصل ہوگا، اس کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں ایک خاص جنتی کا عبرت آموز واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدائی دس آیتوں میں چند باتیں بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ کا لفظی ترجمہ یہ ہے "انہی لوگوں کے لئے ایسا رزق ہے جس کا حال معلوم ہے" مفسرین نے اس کے مختلف مطلب بتائے ہیں۔ بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس سے جنتی غذاؤں کی ان تفصیلی صفات کی طرف اشارہ ہے جو مختلف سورتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ چنانچہ خلاصۂ تفسیر میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اسی تفسیر کو اختیار فرمایا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ "رزق معلوم" سے مراد یہ ہے کہ اس کے اوقات متعین اور معلوم ہیں، یعنی وہ صبح و شام پابندی کے ساتھ عطا کیا جائے گا، جیسا کہ دوسری آیت میں بُكْرَةً وَعَشِيًّا (صبح و شام) کے الفاظ صراحۃً آئے ہیں ـــــ ایک تیسری تفسیر اور ہے، اور وہ یہ کہ "رزقِ معلوم" کا مطلب یہ ہے کہ وہ یقینی اور دائمی رزق ہوگا، دنیا کی طرح نہیں کہ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ کل مجھے کیا اور کتنا رزق ملنے والا ہے؟ اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ جتنا رزق مجھے حاصل ہے وہ کب تک میرے پاس رہے گا؟ ہر انسان کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ جو نعمتیں مجھے اس وقت حاصل ہیں وہ شاید کل میرے پاس نہ رہیں، جنت میں یہ خطرہ نہیں ہوگا، بلکہ وہاں کا رزق یقینی بھی ہوگا اور دائمی بھی (تفسیر قرطبی وغیرہ)

(۲) فَوَاكِهُ، اس لفظ کے ذریعہ قرآن نے جنت کے رزق کی خود تفسیر فرما دی ہے کہ وہ رزق میووں پر مشتمل ہوگا۔ فَوَاكِهُ، فَاكِهَةٌ کی جمع ہے، اور عربی میں فاکہہ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بھوک کی ضرورت رفع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ لذت حاصل کرنے کے لئے کھائی جائے اردو میں اس کا ترجمہ "میوہ" اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ میوہ بھی لذت حاصل کرنے کے کھایا جاتا ہے، ورنہ درحقیقت "فاکہہ" کا مفہوم میوے کے مفہوم سے زیادہ عام ہے ـــــ امام رازیؒ نے اسی "فواکہ" کے لفظ سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جنت میں جتنی غذائیں دی جائیں گی وہ سب لذت بخشنے کے لئے دی جائیں گی، بھوک کی حاجت رفع کرنے کے لئے نہیں۔ اس لئے کہ جنت میں انسان کو حاجت کسی چیز کی نہیں ہوگی، وہاں اسے اپنی زندگی برقرار رکھنے یا حفظانِ صحت

کے لئے بھی کسی غذا کی ضرورت نہیں ہوگی، یہاں خواہش ہوگی، اس خواہش کے پورے ہونے سے لذت حاصل ہوگی، اور جنت کی تمام نعمتوں کا مقصد لذت عطا کرنا ہوگا (تفسیر کبیر، ص ۹۸ ج ۷)

(۳) وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ، کہہ کر بتادیا گیا کہ اہل جنت کو یہ رزق پورے اعزاز واکرام کے ساتھ دیا جائے گا۔ کیونکہ اعزاز واکرام نہ ہو تو لذیذ سے لذیذ غذا بھی بے حلاوت ہو جاتی ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہمان کا حق صرف کھانا کھلانے سے پورا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اعزاز واکرام بھی اس کے حقوق میں داخل ہے۔

(۴) عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ، یہ اہل جنت کی مجلس کا نقشہ ہے کہ وہ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے، کسی کی کسی کی طرف پشت نہیں ہوگی، اس کی عملی صورت کیا ہوگی! اس کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ مجلس کا دائرہ اتنا وسیع ہوگا کہ کسی کو کسی کی طرف پشت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اہل جنت کو ایسی قوت بینائی، سماعت اور گویائی عطا فرمادے گا کہ وہ دور بیٹھے ہوئے لوگوں سے بڑے آرام کے ساتھ باتیں کرسکیں۔

اور بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ تخت گھومنے والے ہوں گے، اور جس سے بات کرنی ہو اسی کی طرف گھوم جائیں گے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم

(۵) لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ، "لَذَّة" اصل میں مصدر ہے، جس کے معنی ہیں لذیذ ہونا، اسی لئے بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اصل میں "ذَاتِ لَذَّةٍ" تھا، یعنی "لذت والی" لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو اگر "لَذَّة" کو مصدر ہی سمجھا جائے تو مصدر اسم فاعل کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ شراب پینے والوں کے لئے "بہت لذت" ہوگی۔ اس کے علاوہ "لَذَّةٌ" کا صیغہ صفت لَذِيْذٌ کے علاوہ لَذٌّ بھی آتا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہاں لَذَّةٌ اسی لَذٌّ کا مؤنث ہو (تفسیر قرطبی) اس صورت میں معنی ہوں گے "پینے والوں کے لئے لذیذ"

(۶) لَا فِيْهَا غَوْلٌ۔ غَوْلٌ کے معنی کسی نے "دردِ سر" بیان کئے ہیں، کسی نے "پیٹ کا درد" کسی نے "بدبو اور گندگی" اور کسی نے "عقل کا بہک جانا" درحقیقت لفظ "غَوْل" ان سبھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں "غَوْل" آفت کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جنت کی شراب میں ایسی کوئی آفت نہیں ہوگی جیسی دنیا کی شرابوں میں پائی جاتی ہیں، نہ دردِ سر ہوگا، نہ دردِ شکم، نہ بدبو کا بھبکارہ، نہ عقل کا بہک جانا (تفسیر ابن جریرؒ)

(۷) قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ، یہ جنت کی حوروں کی صفت ہے کہ وہ "نگاہیں نیچی رکھنے والی" ہوں گی، مطلب یہ ہے کہ جن شوہروں کے ساتھ ان کا ازدواجی رشتہ اللہ تعالیٰ نے قائم کردیا، وہ

اُن کے علاوہ کسی بھی مرد کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گی۔ علامہ ابن جوزیؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ عورتیں اپنے شوہروں سے کہیں گی "میرے پروردگار کی عزت کی قسم! جنت میں مجھے تم سے بہتر کوئی نظر نہیں آتا جس اللہ نے مجھے تمہاری بیوی اور تمہیں میرا شوہر بنایا تمام تعریفیں اسی کی ہیں"!

"نگاہیں نیچی رکھنے والی" کا ایک اور مطلب علامہ ابن جوزیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی نگاہیں نیچی رکھیں گی۔ یعنی وہ خود اتنی خوب صورت اور وفا شعار ہوں گی کہ ان کے شوہروں کو کسی اور کی طرف نظر اٹھانے کی خواہش ہی نہ ہوگی (تفسیر زاد المسیر لابن جوزیؒ ص ۵۷ و ۵۸ ج ۷)

(۸) كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ، اس آیت میں جنت کی حوروں کو "چھپے ہوئے انڈوں" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اہل عرب کے یہاں یہ تشبیہ مشہور ومعروف تھی، جو انڈے پروں میں چھپا ہوا ہو اس پر بیرونی گرد وغبار کا اثر نہیں پہنچتا۔ اس لئے وہ نہایت صاف ستھرا ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس کا رنگ زردی مائل سفید ہوتا ہے جو اہل عرب کے یہاں عورتوں کے لئے دلکش ترین رنگ شمار ہوتا تھا، اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی۔ اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہاں انڈوں سے تشبیہ نہیں ہے، بلکہ انڈوں کی اس جھلی سے ہے جو چھلکے کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ عورتیں اس جھلی کی طرح نرم ونازک اور گداز ہوں گی (روح المعانی) واللہ سبحانہٗ اعلم

ایک جنتی اور اس کا کافر ملاقاتی

ابتدائی دس آیتوں میں اہل جنت کے عمومی حالات بیان فرمانے کے بعد ایک جنتی کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے، کہ وہ جنت کی مجلس میں پہنچنے کے بعد اپنے ایک کافر دوست کو یاد کرے گا جو دنیا میں آخرت کا منکر تھا اور پھر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اسے جہنم کے اندر جھانک کر اس سے باتیں کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اس شخص کا کچھ نام ونسب نہیں بتایا گیا۔ اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون ہوگا؟ تاہم بعض مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس مؤمن شخص کا نام یہوداہ اور اس کے کافر ملاقاتی کا نام قطروس ہے۔ اور یہ وہی دو ساتھی ہیں جن کا ذکر سورۂ کہف کی آیت وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ الخ میں گزر چکا ہے (تفسیر مظہری)

اور علامہ سیوطیؒ نے متعدد تابعین سے اس شخص کی تعیین کے لئے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو آدمی کاروبار میں شریک تھے، ان کو آٹھ ہزار دینار کی آمدنی ہوئی، اور دونوں نے چار چار ہزار دینار آپس میں بانٹ لئے۔ ایک شریک نے اپنی رقم میں سے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک زمین خریدی۔ دوسرا ساتھی بہت نیک تھا، اس نے یہ دعا کی کہ "یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک زمین خریدی ہے، میں آپ سے ایک

ہزار دینار کے عوض جنّت میں زمین خریدتا ہوں" اور ایک ہزار دینار کا صدقہ کر دیا۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنوایا، تو اس شخص نے کہا "یا اللہ فلاں شخص نے ایک ہزار دینار میں ایک گھر تعمیر کیا ہے، میں ایک ہزار دینار میں آپ سے جنّت کا ایک گھر خریدتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے مزید ایک ہزار دینار صدقہ کر دیئے۔ اس کے بعد اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے، تو اس نے کہا "یا اللہ فلاں نے ایک عورت سے شادی کر کے اس پر ایک ہزار دینار خرچ کر دیئے ہیں، اور میں جنّت کی عورتوں میں سے کسی کو پیغام دیتا ہوں اور یہ ایک ہزار دینار نذر کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ ایک ہزار بھی صدقہ کر دیئے۔ پھر اس کے ساتھی نے ایک ہزار دینار میں کچھ غلام اور سامان خریدا تو اس نے پھر ایک ہزار صدقہ کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کے عوض جنّت کے غلام اور جنّت کا سامان طلب کیا۔

اس کے بعد اتفاق سے اس مؤمن بندے کو کوئی شدید حاجت پیش آئی، اسے خیال ہوا کہ میں اپنے سابق شریک کے پاس جاؤں تو شاید وہ نیکی کا ارادہ کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھی سے اپنی ضرورت کا ذکر کیا، ساتھی نے پوچھا، تمہارا مال کیا ہوا؟ اس کے جواب میں اس نے پورا قصّہ سُنا دیا۔ اس پر اس نے حیران ہو کر کہا کہ "کیا واقعی تم اس بات کو سچا سمجھتے ہو کہ ہم جب مر کر خاک ہو جائیں گے تو ہمیں دوسری زندگی ملے گی، اور وہاں ہم کو ہمارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں دوں گا" اس کے بعد دونوں کا انتقال ہو گیا۔ مذکورہ آیات میں جنّتی سے مراد وہ بندہ ہے جس نے آخرت کی خاطر اپنا سارا مال صدقہ کر دیا تھا، اور اس کا جہنّمی ملاقاتی وہی شریکِ کاروبار ہے جس نے آخرت کی تصدیق کرنے پر اس کا مذاق اُڑایا تھا (تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر وغیرہ، ص ۱۶۵ ج ۵)

بُری صحبت سے بچنے کی تعلیم

بہرکیف! اس سے مراد خواہ کوئی ہو یہاں اس واقعہ کو ذکر کرنے سے قرآن کریم کا اصل منشاء لوگوں کو اس بات پر متنبّہ کرنا ہے کہ وہ اپنے حلقۂ احباب کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ اس میں کوئی ایسا شخص تو نہیں ہے جو انھیں کشاں کشاں دوزخ کے انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ بُری صحبت سے جو تباہی آسکتی ہے اس کا صحیح اندازہ آخرت ہی میں ہو گا، اور اس وقت اس تباہی سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو گا، اس لئے دنیا ہی میں دوستیاں اور تعلّقات بہت دیکھ بھال کر قائم کرنے چاہئیں۔ بسا اوقات کسی کافر یا نافرمان شخص سے تعلّقات قائم کرنے کے بعد انسان غیر محسوس طریقے پر اس کے افکار و نظریات اور طرزِ زندگی سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آخرت کے انجام

کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

موت کے خاتمہ پر تعجب

یہاں جس شخص کا یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کافر ساتھی کو دیکھنے کے لئے جہنّم میں جھانکے گا، اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ جنّت کی نعمتوں کو حاصل کر کے فرطِ مسرّت سے یہ کہے گا کہ "کیا اب ہم کبھی نہیں مریں گے؟" اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جنّت کی جاودانی زندگی کا یقین نہیں ہو گا، بلکہ جس شخص کو مسرّتوں کا انتہائی درجہ حاصل ہو جائے وہ بسا اوقات ایسی باتیں کرتا ہے جیسے اسے یقین نہیں ہے کہ یہ مسرّتیں اسے حاصل ہو گئی ہیں، یہ جملے بھی اسی نوعیت کے ہیں۔

آخر میں قرآن کریم اس واقعہ کے اصل سبق کی طرف متوجّہ کر کے فرماتا ہے، لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ (ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے)۔

أَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً

بھلا یہ بہتر ہے مہمانی یا درخت سیہنڈ کا؟ ہم نے اس کو رکھا ہے ایک بلا ظالموں

لِّلظّٰلِمِينَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا

کے واسطے۔ وہ ایک درخت ہے کہ نکلتا ہے دوزخ کی جڑ میں، اس کا خوشہ

كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيٰطِينِ ﴿٦٥﴾ فَإِنَّهُمْ لَءَاكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِـُٔونَ

جیسے سر شیطان کے۔ سو وہ کھائیں گے اس میں سے پھر بھریں گے

مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ إِنَّ

اس سے پیٹ، پھر ان کے واسطے اس کے اوپر ملونی ہے جلتے پانی کی، پھر ان کو

مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ ﴿٦٨﴾ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا ءَابَآءَهُمْ ضَالِّينَ ﴿٦٩﴾

لے جانا ہے آگ کے ڈھیر میں۔ انھوں نے پایا اپنے باپ دادوں کو بہکے ہوئے،

فَهُمْ عَلَىٰٓ ءَاثٰرِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ

سو وہ انہی کے قدموں پر دوڑتے ہیں۔ اور بہک چکے ہیں ان سے پہلے بہت لوگ

الْأَوَّلِينَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِم مُّنذِرِينَ ﴿٧٢﴾ فَانظُرْ كَيْفَ

اگلے۔ اور ہم نے بھیجے ہیں ان میں ڈر سنانے والے۔ اب دیکھ کیسا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٧٤﴾

انجام ڈرائے ہوؤں کا ، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے -

خُلاصۂ تفسیر

(عذاب اور ثواب دونوں کا موازنہ کرکے اب اہل ایمان کو ترغیب اور کفار کو ترہیب فرماتے ہیں کہ بتلاؤ) بھلا یہ دعوت (جنّت کی نعمتوں کی) بہتر ہے (جو اہل ایمان کے لئے ہی) یا زقوم کا درخت (جو کفار کے لئے ہے) ہم نے اس درخت کو (آخرت کی سزا بنانے کے علاوہ دنیا میں بھی ان) ظالموں کے لئے موجب امتحان بنایا ہے (کہ اس کو سُن کر تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب واستہزاء کرتے ہیں چنانچہ کفار تکذیب و استہزاء سے پیش آئے ، کہنے لگے کہ زقوم تو مسکہ اور خرما کو کہتے ہیں، وہ تو خوب لذیذ چیز ہے۔ اور کہنے لگے کہ زقوم اگر درخت ہو تو دوزخ میں جو آگ ہی آگ ہے درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ) وہ ایک درخت ہے جو قعرِ دوزخ میں سے نکلتا ہے (یعنی مسکہ اور خرما نہیں ہے، اور چونکہ وہ خود آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے اس لئے وہاں رہنا بعید نہیں، جیسے سمندر نامی جانور آگ میں پیدا ہوتا ہے، اور آگ ہی میں رہتا ہے، اس سے دونوں باتوں کا جواب ہو گیا۔ آگے زقوم کی ایک کیفیت مذکور ہے، کہ) اس کے پھل ایسے (کریہہ المنظر) ہیں جیسے سانپ کے پھن (پس ایسے درخت سے ظالموں کی دعوت ہوگی) تو وہ لوگ (بھوک کی شدت میں جب اور کچھ نہ ملیگا تو) اس سے کھاویں گے اور (چونکہ بھوک سے بے چین ہوں گے) اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر (جب پیاس سے بے قرار ہو کر پانی مانگیں گے تو) اُن کو کھولتا ہوا پانی (غساق یعنی پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا اور (یہ نہیں کہ اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے بلکہ اس کے بعد) پھر اخیر ٹھکانا ان کا دوزخ ہی کی طرف ہوگا (یعنی اس کے بعد بھی وہیں ہمیشہ کے لئے رہنا ہوگا، اور انھیں یہ سزا اس لئے دی گئی کہ) انھوں نے (ہدایت آلٰہیہ کا اتباع نہیں کیا تھا بلکہ) اپنے بڑوں کو گمراہی کی حالت میں پایا تھا، پھر یہ بھی انہی کے قدم بقدم تیزی کے ساتھ چلتے تھے (یعنی شوق اور رغبت سے ان کی بے راہی پر چلتے تھے) اور ان (موجودہ کفار) سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہو چکے ہیں اور ہم نے ان میں بھی ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے سو دیکھ لیجئے ان لوگوں کو کیسا (بُرا) انجام ہوا جن کو ڈرایا گیا تھا اور انھوں نے نہ مانا تھا کہ ان پر دنیا ہی میں کیا کیا عذاب نازل ہوا) ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے (یعنی ایمان والے) بندے تھے (وہ اس دنیوی عذاب سے بھی محفوظ رہے)۔

معارف و مسائل

دوزخ اور جنّت دونوں کے تھوڑے تھوڑے حالات بیان فرمانے کے بعد باری تعالیٰ نے ہر انسان کو موازنہ کرنے کی دعوت دی ہے کہ غور کر دان میں سے کونسی حالت بہتر ہے؟ چنانچہ فرمایا اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ! جنّت کی جن نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا وہ بہتر ہیں یا زقوم کا درخت جو دوزخیوں کو کھلایا جائے گا ؟

زقوم کی حقیقت زقوم نام کا ایک درخت جزیرۂ عرب کے علاقہ تہامہ میں پایا جاتا ہے، اور علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ یہ دوسرے بنجر صحراؤں میں بھی ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا ہے یہ وہی درخت ہے جسے اردو میں "تھوہڑ" کہتے ہیں، اسی کے قریب قریب ایک اور درخت ہندوستان میں "ناگ پھن" کے نام سے معروف ہے۔ بعض حضرات نے اس کو زقوم قرار دیا ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اب حضرات مفسّرین کی رائیں اس میں مختلف ہیں، کہ جہنمیوں کو جو درخت کھلایا جائے گا وہ یہی دنیا کا زقوم ہے، یا کوئی اور درخت ہے؟ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہی دنیا کا زقوم مراد ہے، اور بعض نے کہا کہ دوزخ کا زقوم بالکل الگ چیز ہے، دنیا کے زقوم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سانپ بچھو وغیرہ دنیا میں بھی ہوتے ہیں اسی طرح دوزخ میں بھی ہوتے ہیں، لیکن دوزخ کے سانپ بچھو یہاں کے سانپ بچھوؤں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوں گے، اسی طرح دوزخ کا زقوم بھی اپنی جنس کے لحاظ سے تو دنیا ہی کے زقوم کی طرح ہوگا، لیکن یہاں کے زقوم سے کہیں زیادہ کریہہ المنظر اور کھانے میں کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم

اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ، یعنی "ہم نے اس (زقوم کے درخت) کو ان ظالموں کے لئے فتنہ بنایا ہے" اس میں فتنہ سے بعض مفسّرین کے نزدیک عذاب مراد ہے، یعنی اس درخت کو عذاب کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ لیکن اکثر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہاں "فتنہ" کا ترجمہ "آزمائش" اور "امتحان" کرنا زیادہ موزوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس درخت کا تذکرہ کرکے ہم یہ امتحان لینا چاہتے ہیں کہ کون اس پر ایمان لاتا ہے؟ اور کون اس کا مذاق اڑاتا ہے! چنانچہ کفارِ عرب اس امتحان میں ناکام رہے، انھوں نے بجائے اس کے کہ اس عذاب سے ڈر کر ایمان لاتے تمسخر واستہزاء کا طریقہ اختیار کیا۔ روایات میں ہے کہ جب قرآن کریم کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں کافروں کو زقوم کھلانے کا تذکرہ ہے، تو ابوجہل نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "تمہارا دوست (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ آگ میں ایک درخت ہے"

حالانکہ آگ تو درخت کو کھاتی ہے، اور خدا کی قسم! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ زقوم کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں، تو آؤ اور یہ کھجور مکھن کھاؤ" (درمنثور، ص ۲۷۷، ج ۵) دراصل زقوم بربری زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے تھے، اس لئے اس نے استہزاء کا یہ طریقہ اختیار کیا۔ باری تعالیٰ نے ایک ہی جملے میں اس کی دونوں باتوں کا جواب دیدیا کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ، یعنی زقوم تو جہنم کی تہہ میں اُگنے والا ایک درخت ہے۔ لہٰذا نہ تو اس سے مراد کھجور اور مکھن ہے اور نہ یہ اعتراض معقول ہے کہ آگ میں درخت کیسے ہو سکتا ہے؟ جب وہ درخت پیدا ہی آگ میں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی خصوصیات رکھ دی ہیں کہ وہ آگ سے جلنے کے بجائے اس سے نشو ونما پاتا ہے، نمونے کے طور پر ایسے کئی حیوانات موجود ہیں جو آگ ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں آگ انھیں جلانے کے بجائے اور نشو ونما عطا کرتی ہے۔

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ، اس آیت میں زقوم کے پھل کو "شیاطین کے سروں" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہاں "شیاطین" کا ترجمہ "سانپوں" سے کیا ہے، یعنی زقوم کا پھل ایسی شکل کا ہوتا ہے جیسے سانپ کا پھن، اردو میں بھی اُسے "ناگ پھن" اسی لئے کہتے ہیں۔ لیکن اکثر مفسرین نے فرمایا کہ یہاں "شیاطین" سے اس کے معروف معنی ہی مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ زقوم کا پھل اپنی بدصورتی میں شیطانوں کے سر کی طرح ہوتا ہے۔ اب یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ شیطان کو تو کسی نے دیکھا نہیں، پھر اس کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی؟ اس لئے کہ یہ ایک تخییلی تشبیہ ہے، محاورہ میں بدصورت اور بدہیئت اشیاء کو شیطان اور جن بھوت سے تشبیہ دیدی جاتی ہے، اس کا منشا محض انتہاء درجے کی بدصورتی بیان کرنا ہوتا ہے، یہاں بھی تشبیہ اسی نوعیت کی ہے۔ (روح المعانی وغیرہ)

باقی آیات کا مفہوم خلاصۂ تفسیر سے واضح ہے۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ

اور ہم کو پکارا تھا نوح نے سو کیا خوب پہنچنے والے ہیں ہم پکار پر، اور بچا دیا اس کو اور اس کے گھر کو

الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا

اُس بڑی گھبراہٹ سے، اور رکھا اس کی اولاد کو وہی باقی رہنے والے۔ اور باقی رکھا

عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ

اس پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے نوح پر سارے جہان والوں میں۔ ہم یوں

نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾

بدلہ دیتے ہیں نیکی والوں کو، وہ ہے ہمارے ایماندار بندوں میں، پھر ڈبا دیا ہم نے دوسروں کو۔

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم کو نوح (علیہ السلام) نے (نصرت کے لئے) پکارا (یعنی دعا کی) سو (ہم نے ان کی فریاد رسی کی اور) ہم خوب فریاد سننے والے ہیں اور ہم نے ان کو اور ان کے تابعین کو بڑے بھاری غم سے (جو کفار کی تکذیب اور ایذا رسانی سے پیش آیا تھا، نجات دی (کہ طوفان سے کفار کو غرق کر دیا اور ان کے تابعین کو بچا لیا) اور ہم نے باقی انہی کی اولاد کو رہنے دیا (اور کسی کی نسل نہیں چلی) اور ہم نے ان کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات (مدت دراز کے لئے) رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں (یعنی خدا کرے تمام اہل عالم جن وانس وملائکہ سلام بھیجا کریں) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں تھے، پھر ہم نے دوسرے (طریق کے) لوگوں کو (یعنی کافروں کو) غرق کر دیا۔

معارف ومسائل

پچھلی آیت میں تذکرہ کیا گیا تھا کہ ہم نے پہلی اُمتوں کے پاس بھی ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تھے، لیکن اکثر لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی، اس لئے ان کا انجام بہت برا ہوا۔ اب یہاں سے اسی اجمال کی کچھ تفصیل بیان کی جارہی ہے، اور اس ضمن میں کئی انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضرت نوحؑ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ ہودؑ میں گزر چکا ہے، یہاں چند باتیں جو خاص طور سے انہی آیات کی تفسیر سے متعلق ہیں درج ذیل کی جاتی ہیں:-

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ہمیں آواز دی تھی۔ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی وہ دعاء ہے جو سورۂ نوحؑ میں مذکور ہے، یعنی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (اے میرے پروردگار! زمین پر کافروں میں سے ایک باشندہ بھی مت چھوڑ) یا جو سورۂ قمر میں مذکور ہے یعنی اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (میں مغلوب ہوں، میری مدد کیجئے) یہ دعاء حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کے بعد اس وقت کی تھی

جبکہ آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلانے پر اکتفاء کرنے کے بجائے اُلٹا آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ (اور ہم نے باقی انہی کی اولاد کو رہنے دیا)، اکثر حضرات مفسرین کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جو طوفان آیا تھا اس میں دنیا کی اکثر آبادی ہلاک ہو گئی تھی، اور اس کے بعد ساری دنیا کی نسل حضرت نوح علیہ السلام ہی کے تین بیٹوں سے چلی۔ ایک بیٹے کا نام سام تھا، اور ان کی اولاد سے اہلِ عرب اور اہلِ فارس وغیرہ کی نسل چلی۔ دوسرے بیٹے حام تھے، اور ان سے افریقی ممالک کی آبادیاں دنیا میں پھیلیں، بعض حضرات نے ہندوستان کے باشندوں کو بھی اسی نسل میں شامل کیا ہے۔ اور تیسرے بیٹے یافث تھے، ان سے ترک، منگول اور یاجوج وماجوج کی نسلیں نکلی ہیں۔ جو لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے بچ گئے تھے ان میں سے حضرت نوح کے ان تین بیٹوں کے سوا کسی اور سے کوئی نسل نہیں چلی۔

البتہ بعض علماء جن کی تعداد بہت کم ہے اس بات کے قائل رہے ہیں کہ طوفانِ نوح پوری دنیا میں نہیں، بلکہ صرف ارضِ عرب میں آیا تھا۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ارضِ عرب میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد باقی رہی، اور انہی سے اہلِ عرب کی نسل چلی، دنیا کے دوسرے خطوں میں دوسروں کی نسل چلنے کی اس آیت سے نفی نہیں ہوتی (بیان القرآن)۔ مفسرین کا ایک تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ طوفانِ نوح تو پوری دنیا میں آیا تھا، لیکن دنیا کی نسل صرف حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں سے نہیں، بلکہ ان تمام لوگوں سے چلی ہے جو کشتی میں حضرت نوح کے ساتھ سوار تھے۔ یہ گروہ آیت میں حصر کو حصرِ اضافی قرار دے کر یہ کہتا ہے کہ یہاں اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ڈوبنے والوں کی نسل نہیں چلی (قرطبی)

قرآن کریم کے سیاق کے لحاظ سے تیسرا قول بہت کم زور ہے اور پہلا قول سب سے بہتر ہے، اس لئے کہ اس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے، جو امام ترمذیؒ وغیرہ نے اس آیت کی تفسیر میں براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا "سام اہلِ عرب کا باپ ہے، حام اہلِ حبشہ کا باپ ہے، اور یافث اہلِ روم کا"۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن اور امام حاکمؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے (روح المعانی، ص ۹۸ ج ۲۳)

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ (اور ہم نے اُن کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات رہنے دی کہ نوحؑ پر سلام ہو عالم والوں میں) اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے اُن کی نظر میں حضرت نوحؑ

کو ایسا معزز و مکرم بنا دیا کہ وہ قیامت تک حضرت نوح علیہ السلام کے لئے سلامتی کی دعا کرتے رہیں گے چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ تمام وہ مذاہب جو اپنے آپ کو آسمانی کتابوں سے منسوب کرتے ہیں سب کے سب حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت اور تقدس کے قائل ہیں، مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی بھی آپ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿۸۳﴾ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۴﴾

اور اسی کی راہ والوں میں ہے ابراہیم۔ جب آیا اپنے رب کے پاس لیکر دل بزرگا

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿۸۵﴾ أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ

جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کیا پوجتے ہو، کیا جھوٹ بنائے ہوئے حاکموں کو اللہ کے

اللَّهِ تُرِيدُونَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً

سوا چاہتے ہو، پھر کیا خیال کیا ہے تم نے پروردگارِ عالم کو؟ پھر نگاہ کی ایک بار

فِي النُّجُومِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ﴿۹۰﴾

تاروں میں، پھر کہا میں بیمار ہونے والا ہوں۔ پھر پھر گئے وہ اس سے پیٹھ دے کر

فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهَتِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ﴿۹۲﴾

پھر جا گھسا اُن کے بتوں میں پھر بولا تم کیوں نہیں کھاتے، تم کو کیا ہے کہ نہیں بولتے؟

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ﴿۹۳﴾ فَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ﴿۹۴﴾ قَالَ

پھر گھسا اُن پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے۔ پھر لوگ آئے اُس پر دوڑ کر گھبراتے ہوئے۔ بولا

أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ ﴿۹۵﴾ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

کیوں پوجتے ہو جو آپ تراشتے ہو؟ اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ﴿۹۷﴾ فَأَرَادُوا بِهِ

بولے بناؤ اس کے واسطے ایک عمارت پھر ڈالو اس کو آگ کے ڈھیر میں۔ پھر چاہنے لگے اس پر

كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿۹۸﴾

بڑا داؤ کرنا پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے۔

خُلاصۂ تفسیر

اور نوح (علیہ السلام) کے طریقہ والوں میں سے (یعنی ان لوگوں میں سے جو اصولِ عقائد میں نوح علیہ السلام کے ساتھ متفق تھے) ابراہیم بھی تھے (ان کا وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے) جب کہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے (صاف دل کا مطلب یہ کہ ان کا دل بدعقیدگی اور دکھلاوے کے جذبہ سے پاک تھا) جبکہ انھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو بُت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا (معبود بنانا) چاہتے ہو تو تمھارا رب العالمین کے ساتھ کیا خیال ہے، (یعنی تم نے جو اس کی عبادت ترک کر رکھی ہے تو کیا اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ یعنی اول تو ایسا نہ ہونا چاہئے اور اگر کوئی شبہ ہے تو اسے رفع کرلو۔ غرض یوں ہی بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا، ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کا کوئی تہوار آیا، قوم نے اُن سے بھی درخواست کی کہ ہمارے میلہ میں چلو) سو ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہونے کو ہوں (اس لئے میلہ میں نہیں جاسکتا) غرض وہ لوگ (ان کا یہ عذر سن کر) اُن کو چھوڑ کر چلے گئے (کہ ناحق بیماری میں ان کو اور ان کی وجہ سے اوروں کو تکلیف ہوگی) تو یہ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) اُن کے بتوں میں جاگھسے اور (استہزاء کے طور پر ان سے) کہنے لگے کیا تم (یہ چڑھاوے جو تمھارے سامنے رکھے ہیں) کھاتے نہیں ہو (اور) تم کو کیا ہوا تم بولتے بھی نہیں؟ پھر اُن پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (اور کلہاڑی وغیرہ سے ان کو توڑ پھوڑ دیا) سو ان لوگوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو) وہ لوگ اُن کے پاس دوڑتے ہوئے (گھبراتے ہوئے غصہ میں) آئے اور (گفتگو شروع ہوئی) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود (اپنے ہاتھ سے) تراشتے ہو (تو جو تمھارا محتاج ہو وہ خدا کیا ہوگا!) حالانکہ تم کو اور تمھاری بنائی ہوئی ان چیزوں کو (سب کو) اللہ ہی نے پیدا کیا ہے (سو عبادت اسی کی کرنا چاہئے) وہ لوگ (جب مناظرہ میں مغلوب ہوئے تو جھلا کر باہم) کہنے لگے کہ ابراہیم کے لئے ایک آتش خانہ تعمیر کرو (اور اس میں آگ دہکا کر) ان کو اس دہکتی آگ میں ڈال دو، غرض ان لوگوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کرنی چاہی تھی (کہ یہ ہلاک ہوجائیں گے) سو ہم نے انہی کو نیچا دکھایا (جس کا قصہ سورۃ انبیاء میں گذر چکا ہے)۔

مَعارف و مَسَائل

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کے بعد قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کے دو واقعے ذکر کئے ہیں، دونوں واقعے ایسے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض اللہ کے واسطے عظیم قربانیاں پیش کیں۔ ان میں سے پہلا واقعہ جو مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ ہے، اور اس کی تفصیلات سورۃ انبیاء میں گذر چکی ہیں، البتہ یہاں جس انداز میں اس کو بیان کیا گیا ہے اس میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ، شِيْعَةٌ عربی زبان میں اس گروہ یا جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد بنیادی نظریات اور طور طریق میں یکساں ہوں۔ اور یہاں ظاہر یہی ہے کہ شِيْعَتِهٖ کی ضمیر حضرت نوح علیہ السلام کی طرف راجع ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پیش رو نبی حضرت نوح علیہ السلام کے طریقے پر تھے، اور بنیادی اصولِ دین میں دونوں کا مکمل اتفاق تھا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کی شریعتیں بھی یکساں یا ملتی جلتی ہوں۔ واضح رہے کہ بعض تاریخی روایات کے مطابق حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس سال کا وقفہ ہے، اور دونوں کے درمیان حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کے سوا کوئی اور نبی نہیں ہوا (کشاف، ص ۴۸ ج ۴)۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ، اس کے ٹھیٹھ لفظی معنی یہ ہیں: "جبکہ وہ آئے اپنے پروردگار کے پاس صاف دل لے کر" اور پروردگار کے پاس آنے سے مراد ہے، اللہ کی طرف رجوع کرنا، اس کی طرف متوجہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا۔ اس کے ساتھ "صاف دل" کی قید لگا کر اشارہ کردیا گیا ہے کہ اللہ کی کوئی عبادت اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہے جب تک کہ عبادت کرنے والے کا دل غلط عقیدوں اور بُرے جذبات سے پاک نہ ہو، اگر غلط عقیدے کے ساتھ کوئی عبادت کی جائے تو خواہ عبادت گذار نے اس میں کتنی محنت اٹھائی ہو وہ قابلِ قبول نہیں۔ اسی طرح اگر عبادت کرنے والے کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے دکھلاوا ہو یا کوئی مادی منفعت ہو تو وہ عبادت قابلِ تعریف نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رجوع الی اللہ ان تمام ملاوٹوں سے پاک تھا۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ، ان آیتوں کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ایک خاص دن میں تہوار منایا کرتی تھی، جب وہ دن آیا تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دعوت دی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ جشن میں شرکت کے لئے چلیں

مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس جشن میں ہمارے ساتھ رہیں گے تو شاید ہمارے دین سے متاثر ہو جائیں، اور اپنے دین کی دعوت چھوڑ دیں۔ (درمنثور وابن جریر وغیرہ) لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقعہ سے دوسرا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، آپ کا ارادہ یہ تھا کہ جب ساری قوم جشن منانے چلی جائے گی تو میں ان کی عبادت گاہوں میں جاکر اُن کے بُتوں کو توڑ ڈالوں گا، تاکہ یہ لوگ واپس آکر اپنے چھوٹے معبودوں کی بے بسی کا عملی نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، ہو سکتا ہے کہ اپنے بُتوں کو بے بس دیکھ کر کسی کے دل میں ایمان پیدا ہو اور وہ شرک سے توبہ کرلے۔ اس غرض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ساتھ جانے سے انکار فرمادیا، لیکن انکار کا طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ پہلے نگاہ بھر کر ستاروں کو دیکھا اور پھر کہا کہ "میں بیمار ہوں" قوم والوں نے آپ کو معذور سمجھ کر چھوڑ دیا اور جشن منانے چلے گئے۔

اس واقعے سے متعدد تفسیری اور فقہی مباحث متعلق ہیں، یہاں ان کا خلاصہ پیش خدمت ہے

ستاروں پر نگاہ ڈالنے کا مقصد سب سے پہلی بحث تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دینے سے پہلے جو ستاروں پر نظر ڈالی، اس کا مقصد کیا تھا؟ بعض حضرات نے تو یہ فرمایا ہے کہ یہ محض ایک اتفاقی عمل تھا، کسی اہم بات کو سوچتے ہوئے انسان بعض اوقات بے اختیار آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے، جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تو آپ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اس دعوت کو کس طرح ٹالوں؟ اسی سوچ کے عالم میں آپ نے بے اختیار ستاروں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد جواب دیا ——— ستاروں پر نظر ڈالنے کی یہ تشریح بظاہر بے غبار معلوم ہوتی ہے، لیکن قرآن کریم کے اسلوب کے پیش نظر اسے درست کہنا مشکل ہے۔ اول تو اس لئے کہ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ واقعات کے صرف اہم اور ضروری اجزاء کو بیان فرماتا ہے، اور غیر ضروری تفصیلات کو چھوڑ دیتا ہے، خود انہی آیتوں میں واقعے کے کئی اجزاء محذوف ہیں، یہاں تک کہ اس کا پورا پس منظر بھی بیان نہیں کیا گیا، اس لئے یہ باور کرنا ممکن نہیں کہ قرآن کریم نے واقعے کے پس منظر کو تو تطویل کے خیال سے چھوڑ دیا ہو اور ایک قطعی غیر اختیاری عمل جس کا واقعے سے دور دراز کا بھی تعلق نہ تھا اسے پوری ایک آیت میں بیان فرمایا ہو۔ دوسرے اگر ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص حکمت پیش نظر نہیں تھی، بلکہ یہ ایک غیر اختیاری عمل تھا تو عربی زبان کے قواعد کی رُو سے فَنَظَرَ نَظْرَةً اِلَى النُّجُوْمِ کہنا چاہیے تھا، فِی النُّجُوْمِ نہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ستاروں کو دیکھنے میں کوئی خاص مصلحت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیش نظر تھی، اسی لئے قرآن کریم نے اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اب وہ

مصلحت کیا تھی؟ اس کے جواب میں اکثر مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم علم نجوم کی بڑی شیدائی تھی، اور ستاروں کو دیکھ دیکھ کر اپنے کاموں کا تعین کیا کرتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھ کر جو جواب دیا اس کا مقصد یہ تھا کہ قوم والے یہ سمجھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ــــ اپنی بیماری کے بارے میں جو کچھ فرما رہے ہیں وہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے، بلکہ ستاروں کے چلن پر غور کر کے کہہ رہے ہیں، اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بذاتِ خود علم نجوم کے قائل نہ ہوں، لیکن جشن کی شرکت سے اپنی گلوخلاصی کے لئے آپ نے طریقہ اختیار فرمایا جو اُن کی نظر میں زیادہ قابلِ اعتماد ہو، اور چونکہ آپ نے زبان سے علم نجوم کا کوئی حوالہ نہیں دیا، نہ یہ بتایا کہ ستاروں کو دیکھنے سے میرا مقصد علم نجوم سے مدد لینا ہے، بلکہ صرف نظر بھر کر ستاروں کو دیکھا، اس لئے اس میں جھوٹ کا بھی کوئی پہلو نہیں ہوا۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل سے ان کافروں کی ہمت افزائی ہوئی ہوگی جو نہ صرف علم نجوم کے قائل تھے، بلکہ ستاروں کو دنیا کے واقعات میں مؤثر حقیقی مانتے تھے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ہمت افزائی تو تب ہوتی جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بعد میں انھیں صراحت کے ساتھ ان کی گمراہیوں پر متنبہ نہ فرماتے، یہاں تو یہ ساری تدبیر کی ہی اس لئے جارہی تھی کہ انھیں توحید کی دعوت زیادہ سے زیادہ مؤثر بنا کر دی جائے، چنانچہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کی ایک ایک گمراہی کو کھول کھول کر بیان فرمادیا، اس لئے محض اس مبہم عمل سے کافروں کی ہمت افزائی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں اصل مقصد جشن کی شرکت سے اپنی جان چھڑانا تھا، تاکہ دعوتِ حق کے لئے زیادہ مؤثر فضا پیدا کی جاسکے، اس مقصد کے لئے ایہام کا یہ طریقہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور اس پر کوئی معقول اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

ستاروں کی طرف دیکھنے کی یہ تشریح اکثر مفسرین سے منقول ہے، اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے بھی بیان القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

علم نجوم کی شرعی حیثیت اس آیت کے تحت دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ علم نجوم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہاں اختصار کے ساتھ اس سوال کا جواب عرض کیا جاتا ہے۔

یہ تو ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاند، سورج اور ستاروں میں کچھ ایسی خاصیتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں، ان میں سے بعض خاصیتیں ایسی ہیں جن کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے، مثلاً سورج کے قرب و بُعد سے گرمی اور سردی کا پیدا ہونا، چاند کے اثر سے چڑھاؤ سے سمندر میں مدّ و جزر وغیرہ، اب بعض حضرات کا

کہنا تو یہ ہے کہ ان ستاروں کی خصوصیات صرف اتنی ہی ہیں جتنی عام مشاہدہ سے معلوم ہوتی ہیں، اور بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ ان کے علاوہ بھی ستاروں کی گردش کے کچھ ایسے خواص ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی کے اکثر معاملات پر اثر ڈالتے ہیں۔ ایک انسان کے لئے کسی ستارے کا کسی خاص برج میں چلے جانا مسرتوں اور کامیابیوں کا سبب بنتا ہے، اور کسی کے لئے غموں اور ناکامیوں کا، پھر بعض لوگ تو ان ستاروں ہی کو کامیابیوں اور ناکامیوں کے معاملہ میں مؤثر حقیقی مانتے ہیں، اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر اس نے ستاروں کو ایسے خواص عطا کر دیئے ہیں، اس لئے دنیا کے دوسرے اسباب کی طرح وہ بھی انسان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا ایک سبب ہوتے ہیں۔

جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو ستاروں کو مؤثر حقیقی مانتے ہیں، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے انقلابات اور واقعات ستاروں ہی کے رہینِ منت ہیں، ستارے ہی دنیا کے تمام واقعات کے فیصلے کرتے ہیں، تو بلاشبہ ان کا خیال غلط اور باطل ہے، اور یہ عقیدہ انسان کو شرک کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اہل عرب بارش کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خاص ستارہ (جسے "نوء" کہا جاتا تھا) بارش لے کر آتا ہے، اور وہ بارش کے لئے مؤثر حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عقیدے کی سخت تردید فرمائی ہے جس کی تصریح احادیث میں موجود ہے۔

رہے وہ لوگ جو دنیوی واقعات میں مؤثر حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اللہ نے ستاروں کو ایسے خواص عطا فرمائے ہیں جو سبب کے درجہ میں انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس طرح بارش برسانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اس کا ظاہری سبب بادل ہیں، اسی طرح تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کا اصل سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی ہے، لیکن یہ ستارے ان کامیابیوں اور ناکامیوں کا سبب بن جاتے ہیں، سو یہ خیال شرک نہیں ہے، اور قرآن و حدیث سے اس خیال کی نہ تصدیق ہوتی ہے نہ تردید۔ لہٰذا یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کی گردش اور ان کے طلوع و غروب میں کچھ ایسے اثرات رکھے ہوں، لیکن ان اثرات کی جستجو کرنے کے لئے علم نجوم کی تحصیل، اس علم پر اعتماد اور اس کی بناء پر مستقبل کے بارے میں فیصلے کرنا بہرحال ممنوع اور ناجائز ہے، اور احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اِذَا ذُکِرَ الْقَدَرُ فَاَمْسِکُوْا وَاِذَا ذُکِرَتِ النُّجُوْمُ فَاَمْسِکُوْا وَاِذَا ذُکِرَ اَصْحَابِیْ فَاَمْسِکُوْا

(احیاء العلوم للعراقی بحوالۃ طبرانیؒ وھو حدیث حسنہ العراقی)

"جب تقدیر کا ذکر چھڑے تو رُک جاؤ، (یعنی اس میں زیادہ غور و خوض اور بحث مباحثہ نہ کرو) اور جب ستاروں کا ذکر چھڑے تو رُک جاؤ اور جب میرے صحابہؓ کا (یعنی اُن کے باہمی اختلافات وغیرہ کا) ذکر چھڑے تو رُک جاؤ۔"

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

تَعَلَّمُوْا مِنَ النُّجُوْمِ مَا تَهْتَدُوْنَ بِهٖ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ثُمَّ اَمْسِکُوْا

(احیاء علوم الدین للغزالیؒ)

"ستاروں کے علم سے اتنا علم حاصل کرو جس کے ذریعہ تم خشکی اور سمندر میں راستے جان سکو اس کے بعد رُک جاؤ۔"

اس ممانعت سے ستاروں کے خواص و آثار کا انکار لازم نہیں آتا، لیکن ان خواص و آثار کے پیچھے پڑنے ــــ اور ان کی جستجو میں قیمتی اوقات برباد کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس ممانعت کی متعدد حکمتیں بتائی ہیں۔

علم نجوم کے ممنوع و مذموم ہونے کی پہلی حکمت تو یہ ہے کہ جب اس علم میں انسان کا انہماک بڑھتا ہے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ستاروں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے، اور یہ چیز اسے کشاں کشاں ستاروں کے مؤثر حقیقی ہونے کے مشرکانہ عقیدے کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسری حکمت یہ ہے کہ اگر ستاروں میں اللہ تعالیٰ نے کچھ خواص و آثار رکھے بھی ہوں تو ان کے یقینی علم کا ہمارے پاس سوائے وحی کے کوئی راستہ نہیں ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا کوئی علم عطا فرمایا تھا لیکن اب وہ علم جس کی بنیاد وحی الٰہی پر تھی، دنیا سے مٹ چکا ہے، اب علم نجوم کے ماہرین کے پاس جو کچھ ہے وہ محض قیاسات، اندازے اور تخمینے ہیں، جن سے کوئی یقینی علم حاصل نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ نجومیوں کی بے شمار پیشینگوئیاں آئے دن غلط ثابت ہوتی رہتی ہیں، کسی نے اس علم کے بارے میں بہترین تبصرہ کیا ہے کہ،

مفیدہٗ غیر معلوم ومعلومہٗ غیر مفید

"یعنی اس علم کا جتنا حصہ مفید ہو سکتا ہے وہ کسی کو معلوم نہیں اور جتنا لوگوں کو معلوم ہے وہ فائدہ مند نہیں۔"

علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں تاریخی واقعات کی ایسی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جن میں علم نجوم کے مسلّمہ قواعد کے تحت ایک واقعہ جس طرح پیش آنا چاہیے تھا حقیقت میں اس کے بالکل برعکس پیش آیا، چنانچہ جن بڑے بڑے لوگوں نے اس علم کی تحصیل میں اپنی عمریں کھپائی ہیں وہ آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اس علم کا انجام قیاس و تخمین سے آگے کچھ نہیں۔ ایک مشہور منجم

کوشیار دیلمی نے علم نجوم پر اپنی کتاب المجمل فی الاحکام میں لکھا ہے:

"علم نجوم ایک غیر مدلل علم ہے، اور اس میں انسان کے وسوسوں اور گمانوں کے لئے بڑی گنجائش ہے" (روح المعانی، ص ۱۱۶ ج ۲۳)

علامہ آلوسیؒ نے اور بھی متعدد علماء نجوم کے اسی قسم کے اقوال نقل فرمائے ہیں، بہرحال! یہ بات طے شدہ ہے کہ علم نجوم کوئی یقینی علم نہیں ہے، اور اس میں غلطیوں کے بے حساب احتمالات ہوتے ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس علم کی تحصیل میں لگتے ہیں وہ اسے بالکل قطعی اور یقینی علم کا درجہ دے بیٹھتے ہیں، اسی کی بناء پر مستقبل کے فیصلے کرتے ہیں، اسی کی وجہ سے دوسروں کے بارے میں اچھی بُری رائیں قائم کر لیتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس علم کا جھوٹا پندار بعض اوقات انسان کو علم غیب کے دعووں تک پہنچا دیتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر چیز بے شمار مفاسد پیدا کرنے والی ہے۔

علم نجوم کی ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ یہ عمرِ عزیز کو ایک بے فائدہ کام میں صرف کرنے کے مرادف ہے، جب اس سے کوئی نتیجہ یقینی طور پر حاصل نہیں کیا جا سکتا تو ظاہر ہے کہ دنیا کے کاموں میں یہ علم چنداں مددگار نہیں ہو سکتا۔ اب خواہ مخواہ ایک بے فائدہ چیز کے پیچھے پڑنا اسلامی شریعت کی رُوح اور مزاج کے بالکل خلاف ہے، اس لئے اس کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیماری کا مطلب

اس آیت سے متعلق تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کی دعوت کے جواب میں جو اِنِّیْ سَقِیْمٌ "(میں بیمار ہوں) فرمایا تو کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت واقعی بیمار تھے؟ قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے، لیکن صحیح بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت ایسے بیمار نہیں تھے کہ قوم کے ساتھ نہ جا سکیں، اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات کیسے ارشاد فرمائی؟

اس کا جواب جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "توریہ" کیا تھا، "توریہ" کا مطلب ہے "کوئی ایسی بات کہنا جو بظاہر واقعہ کے خلاف ہو، لیکن کہنے والے نے اس سے کوئی ایسے دُور کے معنی مراد لئے ہوں جو واقعہ کے مطابق ہوں"۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو جملہ ارشاد فرمایا اس کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ "میں اس وقت بیمار ہوں" لیکن آپ کی اصل مراد یہ نہیں تھی۔ اب اصل مراد کیا تھی؟ اس کے بارے میں مفسرین نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں، بعض نے فرمایا کہ اس سے آپ کا مقصد وہ طبعی انقباض تھا جو آپ کو اپنی قوم کی مشرکانہ حرکات دیکھ دیکھ کر پیدا

ہو رہا تھا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں "سقیم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو "مریض" کے مقابلہ میں بہت ہلکا لفظ ہے، اور اس کا مفہوم اردو میں اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ "میری طبیعت ناساز ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس جملہ میں طبعی انقباض کے مفہوم کی بھی پوری گنجائش پائی جاتی ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ "اِنِّیْ سَقِیْمٌ" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں" اس لئے کہ عربی زبان میں اسم فاعل کا صیغہ بکثرت زمانۂ مستقبل کے لئے استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہے: "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ" اس کے ظاہری الفاظ کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ "تم بھی مُردہ ہو اور وہ بھی مُردہ ہیں"۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں مراد یہ معنیٰ ہیں کہ "تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں"، اسی طرح اِنِّیْ سَقِیْمٌ کے معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ مراد لئے تھے کہ "میں بیمار ہونے والا ہوں"۔ اور یہ اس لئے فرمایا کہ موت سے پہلے پہلے ہر انسان کا بیمار ہونا یقینی امر ہے، اگر کسی کو ظاہری بیماری نہ ہو تب بھی موت سے ذرا پہلے انسان کے مزاج میں خلل کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔

اور اگر کسی کا دل ان تاویلات پر مطمئن نہ ہو تو سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طبیعت اُس وقت واقعۃً تھوڑی بہت ناساز تھی، لیکن بیماری ایسی نہ تھی جو جشن میں شرکت سے مانع ہوتی، آپ نے اپنی معمولی ناسازیٔ طبع کا ذکر ایسے ماحول میں کیا جس سے سننے والے یہ سمجھے کہ آپ کو کوئی بڑی بیماری لاحق ہے، جس کی وجہ سے آپ واقعی ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توریہ کی یہ تشریح سب سے زیادہ معقول اور اطمینان بخش ہے۔

اس تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد "اِنِّیْ سَقِیْمٌ" کے لئے جو "کَذِبَۃ" (جھوٹ) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے مراد "توریہ" ہے جس کی ظاہری شکل جھوٹ ہوتی ہے، لیکن متکلم کی مراد کے لحاظ سے وہ جھوٹ نہیں ہوتا، خود اسی حدیث کی بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں:

مَا مِنْهَا كَذِبَةٌ اِلَّا مَا حَلَّ بِهَا عَنْ دِيْنِ اللّٰهِ	"ان میں سے کوئی جھوٹ ایسا نہیں ہے جو اللہ کے دین کی مدافعت اور حمایت میں نہ بولا گیا ہو"

ان الفاظ نے خود یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں "کذب" اپنے عام معنی سے جدا مفہوم رکھتا ہے، اس حدیث سے متعلق قدرے تفصیلی بحث سورۂ انبیاء میں آیت قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ کے تحت

گزر چکی ہے۔

تَورِیہ کا شرعی حکم | انہی آیات سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر تَورِیہ کرنا جائز ہے تَورِیہ ایک تو قولی ہوتا ہے، یعنی ایسی بات کہنا جس کا ظاہری مفہوم خلافِ واقعہ ہو اور باطنی مراد مطابقِ واقعہ۔ اور ایک توریہ عملی ہوتا ہے، یعنی ایسا عمل کرنا جس کا مقصد دیکھنے والا کچھ سمجھے اور در حقیقت اس کا مقصد کچھ اور ہو، اسے اِیہام بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا (اکثر مفسرین کے قول کے مطابق) ایہام تھا، اور اپنے آپ کو بیمار کہنا تَورِیہ۔

ضرورت کے مواقع پر تَورِیہ کی یہ دونوں قسمیں خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، جس وقت آپؐ ہجرت کے لئے تشریف لیجا رہے تھے، اور مشرکین آپؐ کی تلاش میں لگے ہوئے تھے، تو راستے میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ "یہ کون ہیں؟" حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا، "ھُوَ ھَادٍ یَّھْدِیْنِیْ" (وہ میرے رہنما ہیں، مجھے رستہ دکھاتے ہیں) سننے والا یہ سمجھا کہ عام رستہ بتانے والے رہنما مراد ہیں، اس لئے چھوڑ کر چل دیا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ دینی اور روحانی رہنما ہیں (روح المعانی)

اسی طرح حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کے لئے جس سمت میں جانا ہوتا مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت اس سمت میں روانہ ہونے کے بجائے کسی دوسری سمت میں چلنا شروع فرماتے تھے، تاکہ دیکھنے والوں کو صحیح منزل معلوم نہ ہوسکے (صحیح مسلم وغیرہ) یہ عملی تَورِیہ اور ایہام تھا۔

مزاح اور خوش طبعی کے مواقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تَورِیہ ثابت ہے، شمائل ترمذیؒ میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھی عورت سے مزاحاً فرمایا "کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی" وہ عورت یہ سن کر بہت پریشان ہوئی تو آپؐ نے تشریح فرمائی کہ بوڑھیوں کے جنت میں نہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہ جائیں گی، ہاں جوان ہو کر جائیں گی۔

اس کے بعد کی آیات کا مفہوم خلاصۂ تفسیر سے واضح ہے، اور واقعہ کی تفصیلات سورۂ انبیاء میں گزر چکی ہیں۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٠٠﴾

اور بولا میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دے گا۔ اے رب بخش مجھ کو کوئی نیک بیٹا۔

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ

پھر خوشخبری دی ہم نے اس کو ایک لڑکے کی جو ہوگا تحمل والا۔ پھر جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں

فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا

خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے؟ بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے

تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿١٠٢﴾ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ

تو مجھ کو پائے گا اگر اللہ نے چاہا سہارنے والا۔ پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا

لِلْجَبِينِ ﴿١٠٣﴾ وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿١٠٤﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا

اس کو ماتھے کے بل۔ اور ہم نے اس کو پکارا یوں کہ اے ابراہیم، تو نے سچ کر دکھایا خواب ہم یوں

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٠٥﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾

دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، بیشک یہی ہے صریح جانچنا۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿١٠٨﴾

اور اس کا بدلہ دیا ہم نے ایک جانور ذبح کرنے کو واسطے بڑا، اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں،

سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿١٠٩﴾ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٠﴾ إِنَّهُ

کہ سلام ہے ابراہیم پر۔ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، وہ ہے ہمارے

مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١١﴾ وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿١١٢﴾

ایمان دار بندوں میں، اور خوشخبری دی ہم نے اس کو اسحٰق کی جو نبی ہوگا نیک بختوں میں۔

وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۚ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ

اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحٰق پر اور دونوں کی اولاد میں نیکی والے ہیں اور بدکار بھی اپنے حق میں

مُبِينٌ ﴿١١٣﴾ ع

صریح

خلاصۂ تفسیر

اور ابراہیم (علیہ السلام جب ان لوگوں کے ایمان سے مایوس ہوگئے تو) کہنے لگے کہ میں تو

(تم سے ہجرت کرکے) اپنے رب کی (راہ میں کسی) طرف چلا جاتا ہوں، وہ مجھ کو (اچھی جگہ) پہنچا ہی دیگا، (چنانچہ ملک شام میں جا پہونچے، اور یہ دعا کی کہ) اے میرے رب مجھ کو ایک نیک فرزند دے، سو ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی (اور وہ فرزند پیدا ہوا اور ہوشیار ہوا) سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگا، تو ابراہیم (علیہ السلام) نے (ایک خواب دیکھا کہ میں اس فرزند کو خدا کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں، اور یہ ثابت نہیں کہ حلقوم کٹتا ہوا بھی دیکھا یا نہیں، غرض آنکھ کھلی تو اسے اللہ کا حکم سمجھے، کیونکہ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے اور اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہوگئے۔ پھر یہ سوچ کر کہ خدا جانے میرے فرزند کی اس بارے میں کیا رائے ہو اس کو اطلاع کرنا ضروری سمجھا، اس لئے اس سے) فرمایا کہ برخوردار میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (بامر الٰہی) ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے ابا جان (اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے، جب آپ کو خدا کی طرف سے حکم کیا گیا ہے تو) آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ (بلا تأمل) کیجئے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے، غرض جب دونوں نے (خدا کے حکم کو) تسلیم کرلیا، اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لئے) کروٹ پر لٹایا اور (چاہتے تھے کہ گلا کاٹ ڈالیں اور اس وقت) ہم نے ان کو آواز دی کہ ابراہیم (شاباش ہو) تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (یعنی خواب میں جو حکم ہوا تھا اپنی طرف سے اس پر پورا عمل کیا اب ہم اس حکم کو منسوخ کرتے ہیں بس ان کو چھوڑ دو، غرض ان کو چھوڑ دیا، جان بچ گئی، اور بلند درجات مزید برآں عطا ہوئے)، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ دونوں جہاں کی راحت انھیں عطا کرتے ہیں) حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان (جس کو بجز مخلص کامل کے دوسرا برداشت نہیں کرسکتا تو ہم نے ایسے امتحان میں پورا اُترنے پر صلہ بھی بڑا بھاری دیا، اور اس میں جیسا امتحان ابراہیم علیہ السلام کا تھا، اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کا بھی تھا، تو وہ صلہ میں شریک ہوں گے) اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا، (کہ ابراہیم علیہ السلام سے وہ ذبح کرایا گیا) اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو (چنانچہ ان کے نام کے ساتھ اب تک "علیہ السلام" کہا جا رہا ہے)، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ انہیں لوگوں کی دعاؤں اور سلامتی کی بشارتوں کا مرکز بنا دیتے ہیں) بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے اور ہم نے (ایک انعام ان پر یہ کیا کہ) ان کو اسحاق کی بشارت دی کہ نبی اور نیک بخت میں ہوں گے اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحٰق پر برکتیں نازل کیں (ان برکتوں میں سے ایک یہ کہ انکی نسل بہت پھیلی اور اس نسل میں کثرت سے انبیا پیدا ہوئے) اور (پھر آگے) ان دونوں کی نسل میں بعضے اچھے بھی ہیں اور بعضے ایسے بھی جو (بدیاں کرکے) صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں۔

مَعارف ومَسائل

بیٹے کی قربانی کا واقعہ ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا ایک دوسرا اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی پیش کی، واقعہ کے بنیادی اجزاء خلاصۂ تفسیر سے واضح ہوجاتے ہیں، بعض تاریخی تفصیلات آیتوں کی تفسیر کے ذیل میں آجائیں گی:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (اور ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ میں تو اپنے رب کی طرف چلا جاتا ہوں) یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت ارشاد فرمائی جبکہ آپ اپنے اہل وطن سے بالکل مایوس ہوگئے، اور وہاں آپ کے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا "رب کی طرف چلے جانے" سے مراد یہ ہے کہ میں دار الکفر کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں کا مجھے اپنے رب کی طرف سے حکم ہوا ہے، اور جہاں میں اپنے پروردگار کی عبادت کرسکوں گا، چنانچہ آپ اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت سارہؓ اور اپنے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کو لے کر سفر پر روانہ ہوئے، اور عراق کے مختلف حصوں سے ہوتے ہوئے بالآخر شام تشریف لے آئے۔ اس تمام عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، اس لئے آپ نے وہ دعا فرمائی جس کا اگلی آیت میں ذکر ہے، یعنی:

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ (اے میرے پروردگار! مجھے ایک نیک فرزند عطا فرما) چنانچہ آپ کی یہ دعا قبول ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک فرزند کی پیدائش کی خوشخبری سنائی۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ (پس ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی) "حلیم المزاج" فرما کر اشارہ کر دیا گیا کہ یہ نومولود اپنی زندگی میں ایسے صبر وضبط اور بردباری کا مظاہرہ کرے گا کہ دنیا اس کی مثال نہیں پیش کرسکتی۔ اس فرزند کی ولادت کا واقعہ یہ ہوا کہ جب حضرت سارہؓ نے یہ دیکھا کہ مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی تو وہ سمجھیں کہ میں بانجھ ہوچکی ہوں اُدھر فرعونِ مصر نے حضرت سارہؓ کو اپنی بیٹی جن کا نام ہاجرہؓ تھا، خدمت گزاری کے لئے دیدی تھی، حضرت سارہؓ نے یہی ہاجرہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کر دیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کرلیا، انہی ہاجرہؓ کے بطن سے یہ صاحبزادے پیدا ہوئے اور ان کا نام اسمٰعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ (سو جب وہ فرزند ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے فرمایا، برخوردار میں خواب

میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین روز متواتر دکھایا گیا (قرطبی) اور یہ بات طے شدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اس لئے اس خواب کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر دو۔ یوں یہ حکم براہِ راست کسی فرشتے وغیرہ کے ذریعہ بھی نازل کیا جاسکتا تھا، لیکن خواب میں دکھانے کی حکمت بظاہر یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب کے ذریعہ دیئے ہوئے حکم میں انسانی نفس کے لئے تاویلات کی بڑی گنجائش تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تاویلات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا (تفسیر کبیر)

اس کے علاوہ یہاں باری تعالیٰ کا اصل مقصد نہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا تھا، نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دینا کہ انھیں ذبح کر ہی ڈالو، بلکہ منشاء یہ حکم دینا تھا کہ اپنی طرف سے انھیں ذبح کرنے کے سارے سامان کر کے اُن کے ذبح کا اقدام کر گذرو۔ اب یہ حکم اگر زبانی دیا جاتا تو اس میں آزمائش نہ ہوتی، اس لئے انہیں خواب میں دکھلایا کہ وہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں، اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھے کہ ذبح کا حکم ہوا ہے، اور وہ پوری طرح ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس طرح آزمائش بھی پوری ہو گئی، اور خواب بھی سچا ہو گیا، یہ بات زبانی حکم کے ذریعہ آتی تو یا آزمائش نہ ہوتی، یا حکم کو بعد میں منسوخ کرنا پڑتا۔ ——— یہ امتحان کس قدر سخت تھا؟ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں اللہ تعالیٰ نے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ کے الفاظ بڑھائے ہیں، یعنی ارمانوں سے مانگے ہوئے اس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب یہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا، اور پرورش کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اب وقت آیا تھا کہ وہ قوتِ بازو بن کر باپ کا سہارا بنا ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ بالغ ہو چکے تھے (تفسیر مظہری)

فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے اس لئے نہیں پوچھی کہ آپ کو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں کوئی تردد تھا، بلکہ ایک تو وہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ وہ اس آزمائش میں کس حد تک پورا اُترتا ہے؟ دوسرے انبیاء علیہم السلام کا طرز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی اطاعت کے لئے تو ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن اطاعت کے لئے ہمیشہ رستہ وہ اختیار کرتے ہیں جو حکمت اور حتی المقدور سہولت پر مبنی ہو۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے کچھ کہے بغیر

بیٹے کو ذبح کرنے لگتے، تو یہ دونوں کے لئے مشکل کا سبب ہوتا، اب یہ بات آپ نے مشورہ کے انداز میں بیٹے سے اس لئے ذکر کی کہ بیٹے کو پہلے سے اللہ کا یہ حکم معلوم ہو جائے گا تو وہ ذبح ہونے کی اذیت سہنے کے لئے پہلے سے تیار ہو سکے گا، نیز اگر بیٹے کے دل میں کچھ تذبذب ہوا بھی تو اُسے سمجھایا جاسکے گا۔ (روح المعانی وبیان القرآن) لیکن وہ بیٹا بھی اللہ کے خلیل کا بیٹا تھا اور اسے خود منصبِ رسالت پر فائز ہونا تھا، اس نے جواب میں کہا:

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (ابا جان جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اُسے کر گزریئے)۔ اس سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بے مثال جذبۂ جاں سپاری کی تو شہادت ملتی ہی ہے، اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کم سنی ہی میں اللہ نے انہیں کیسی ذہانت اور کیسا علم عطا فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے سامنے اللہ کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا تھا، بلکہ محض ایک خواب کا تذکرہ فرمایا تھا، لیکن حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سمجھ گئے، کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اور یہ خواب بھی درحقیقت حکمِ الٰہی کی ہی ایک شکل ہے، چنانچہ انھوں نے جواب میں خواب کے بجائے حکمِ الٰہی کا تذکرہ فرمایا۔

وحی غیر متلو کا ثبوت یہیں سے ان منکرینِ حدیث کی واضح تردید ہو جاتی ہے جو وحی غیر متلو کے وجود کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ وحی صرف وہ ہے جو آسمانی کتاب میں نازل ہو گئی، اس کے علاوہ وحی کی کوئی دوسری قسم موجود نہیں ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم خواب کے ذریعہ دیا گیا، اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے صریح الفاظ میں اسے اللہ کا حکم قرار دیا، اگر وحی غیر متلو کوئی چیز نہیں ہے تو یہ حکم کونسی آسمانی کتاب میں اُترا تھا؟

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنی طرف سے اپنے والد بزرگوار کو یہ یقین بھی دلایا کہ:-

سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے) اس جملے میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی غایت ادب اور غایت تواضع کو دیکھئے۔ ایک تو اِنْ شَآءَ اللّٰهُ کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا اور اس وعدے میں دعوے کی جو ظاہری صورت پیدا ہو سکتی تھی اسے ختم فرما دیا۔ دوسرے آپ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ "آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے" لیکن اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ "آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے" جس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ صبر و ضبط تنہا میرا کمال نہیں ہے بلکہ دنیا میں اور بھی بہت سے صبر کرنے والے ہوئے ہیں، انشاء اللہ میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں گا۔ اس طرح آپ نے اس جملے میں فخر و تکبر، خود پسندی اور پندار کے ہر ادنیٰ شائبے کو ختم کر کے اس میں انتہا درجے کی تواضع اور انکسار کا اظہار فرما دیا (روح المعانی) اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو

کس معاملے میں اپنے اوپر خواہ کتنا ہی اعتماد ہو، لیکن اُسے ایسے بلند بانگ دعوے نہیں کرنے چاہئیں جن سے غرور و تکبّر ٹپکتا ہو، اگر کہیں ایسی کوئی بات کہنے کی ضرورت ہو تو الفاظ میں اس کی رعایت ہونی چاہئے، کہ ان میں اپنے بجائے اللہ پر بھروسہ کا اظہار ہو، اور جس حد تک ممکن ہو تواضع کے دامن کو نہ چھوڑا جائے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا (پس جب وہ دونوں جُھک گئے) اَسْلَمَ کے معنی ہیں جُھک جانا، مطیع ہوجانا، رام ہوجانا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے حکم کے آگے جُھک گئے، یعنی باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا اور بیٹے نے ذبح ہوجانے کا ارادہ کرلیا، یہاں تَلَّا (جب) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن اس کا جواب مذکور نہیں ہے، یعنی آگے یہ نہیں بتایا گیا کہ جب یہ واقعات پیش آچکے تو کیا ہوا؟ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باپ بیٹے کا یہ اقدام فدا کاری اس قدر عجیب و غریب تھا کہ الفاظ اس کی پوری کیفیت کو بیان کرہی نہیں سکتے۔

بعض تاریخی اور تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے تین مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی، ہر بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے سات سات کنکریاں مار کر بھگا دیا۔ آج تک منیٰ کے تین جمرات پر اسی محبوب عمل کی یاد کنکریاں مار کر منائی جاتی ہے، بالآخر جب دونوں باپ بیٹے یہ انوکھی عبادت انجام دینے کے لئے قربان گاہ پر پہنچے تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابّا جان مجھے خوب اچھی طرح باندھ دیجئے، تاکہ میں زیادہ تڑپ نہ سکوں، اور اپنے کپڑوں کو بھی مجھ سے بچائیے، ایسا نہ ہو کہ ان پر میرے خون کی چھینٹیں پڑیں، تو میرا ثواب گھٹ جائے، اس کے علاوہ میری والدہ خون دیکھیں گی تو انھیں غم زیادہ ہوگا، اور اپنی چھری بھی تیز کرلیجئے، اور اسے میرے حلق پر ذرا جلدی جلدی پھیریئے گا، تاکہ آسانی سے میرا دم نکل سکے، کیونکہ موت بڑی سخت چیز ہے، اور جب آپ میری والدہ کے پاس جائیں تو ان سے میرا سلام کہہ دیجئے گا، اور اگر آپ میرا قمیص والدہ کے پاس لے جانا چاہیں تو لے جائیں، شاید اس سے انھیں کچھ تسلّی ہو۔ اکلوتے بیٹے کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر ایک باپ کے دل پر کیا گذر سکتی ہے؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام استقامت کے پہاڑ بن کر جواب یہ دیتے ہیں کہ "بیٹے! تم اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے میرے کتنے اچھے مددگار ہو" یہ کہکر انھوں نے بیٹے کو بوسہ دیا، پُر نم آنکھوں سے انھیں باندھا۔ (مظہری) اور :-

وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (انھیں پیشانی کے بَل خاک پر لٹا دیا) حضرت ابن عباسؓ سے اس کا مطلب یہ منقول ہے کہ انھیں اس طرح کروٹ پر لٹا دیا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین سے چھونے لگا (مظہری) لغت کے اعتبار سے یہ تفسیر راجح ہے۔ اس لئے کہ جَبِیْنٌ عربی زبان میں پیشانی کی

دونوں کروٹوں کو کہتے ہیں، اور پیشانی کا درمیانی حصہ جَبْہَۃٌ کہلاتا ہے۔ اسی لئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ کروٹ پر لٹانے سے کیا ہے، لیکن بعض دوسرے حضرات مفسّرین نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اوندھے مُنہ زمین پر لٹا دیا۔ بہرصورت تاریخی روایات میں اس طرح لٹانے کی جو یہ بیان کی گئی ہے کہ شروع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں سیدھا لٹایا تھا، لیکن جب چھری چلانے لگے تو بار بار چلانے کے باوجود گلا کٹتا نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے بیچ کا ایک ٹکڑا بیچ میں حائل کردیا تھا، اس موقع پر بیٹے نے خود یہ فرمائش کی کہ ابّا جان! مجھے چہرے کے بَل کروٹ سے لٹا دیجئے، اس لئے کہ جب آپ کو میرا چہرہ نظر آتا ہے تو شفقتِ پدری جوش مارنے لگتی ہے، اور گلا پوری طرح کٹ نہیں پاتا، اس کے علاوہ چھری مجھے نظر آتی ہے تو مجھے بھی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اسی طرح لٹا کر چھری چلانی شروع کی (تفسیر مظہری وغیرہ) واللہ اعلم

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ، (اور ہم نے انھیں آواز دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا) یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں جو کام تمہارے کرنے کا تھا اس میں تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (خواب میں بھی غالباً صرف یہی دکھایا گیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انھیں ذبح کرنے کے لئے چھری چلا رہے ہیں) اب یہ آزمائش پوری ہوچکی اس لئے اب انہیں چھوڑ دو۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ، (ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) یعنی جب کوئی اللہ کا بندہ اللہ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے اپنے تمام جذبات کو قربان کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے، تو ہم بالآخر اسے دنیوی تکلیف سے بھی بچا لیتے ہیں، اور آخرت کا اجر و ثواب بھی اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتے ہیں۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا) روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آسمانی آواز سُن کر اُوپر کی طرف دیکھا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ایک مینڈھا لئے کھڑے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی مینڈھا تھا جس کی قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے صاحبزادے ہابیلؓ نے پیش کی تھی۔ واللہ اعلم

بہرحال یہ جنتی مینڈھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا ہوا، اور انھوں نے اللہ کے حکم سے اپنے بیٹے کے بجائے اس کو قربان کیا۔ اس ذبیحہ کو "عظیم" اس لئے کہا گیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا تھا اور اس کی قربانی کے مقبول ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ (تفسیر مظہری وغیرہ)

ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ یا حضرت اسحٰقؑ

اوپر آیات کی تفسیر تسلیم کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے،

لیکن درحقیقت اس معاملہ میں مفسرین اور مؤرخین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عباسؓ، حضرت ابن عباسؓ، کعب الاحبارؒ، سعید بن جبیرؒ، قتادہؒ، مسروقؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، مقاتلؒ، زہریؒ اور سدیؒ سے منقول ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحٰق علیہ السلام تھے، اس کے برخلاف حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو الطفیلؒ، سعید بن المسیبؒ، سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ، مجاہدؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، شعبیؒ، محمد بن کعب قرظیؒ اور دوسرے بہت سے تابعین سے منقول ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔

بعد کے مفسرین میں سے حافظ ابن جریر طبریؒ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ نے دوسرے قول کو اختیار کر کے پہلے قول کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے۔ یہاں فریقین کے دلائل پر مفصل تبصرہ ممکن نہیں، تاہم قرآن کریم کے اسلوب بیان اور روایات کی قوت کے لحاظ سے راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن صاحبزادے کے ذبح کا حکم دیا گیا وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تھے، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) قرآن کریم نے بیٹے کی قربانی کا پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (اور ہم نے ان کو اسحٰقؑ کی بشارت دی کہ نبی اور نیک لوگوں میں سے ہوں گے) اس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور تھے، اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت انکی قربانی کے واقعہ کے بعد دی گئی۔

(۲) حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اسی بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام نبی ہوں گے، اس کے علاوہ ایک دوسری آیت میں مذکور ہے، کہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کے ساتھ یہ بشارت بھی دیدی گئی تھی کہ ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوں گے، (فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ) اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ بڑی عمر تک زندہ رہیں گے، یہاں تک کہ صاحب اولاد ہوں گے، پھر انہی کو بچپن میں ذبح کرنے کا حکم کیونکر دیا جاسکتا تھا، اور اگر انہی کو بچپن میں نبوت سے قبل ذبح کرنے کا حکم دیا جاتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ جاتے کہ انہیں تو ابھی نبوت کے منصب پر فائز ہونا ہے اور ان کی صلب سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش مقدر ہے، اس لئے ذبح کرنے

سے انھیں موت نہیں آسکتی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ یہ کوئی بڑا امتحان ہوتا، اور نہ حضرت ابراہیمؑ اس کی انجام دہی میں کسی تعریف کے مستحق ہوتے، امتحان تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری طرح یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ میرا یہ بیٹا ذبح کرنے سے ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ ذبح کرنے کا اقدام کریں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے معاملہ میں یہ بات پوری طرح صادق آتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے زندہ رہنے اور نبی بننے کی کوئی پیشگوئی نہیں فرمائی تھی۔

(۳) قرآن کریم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا بچہ تھا، اس لئے کہ انھوں نے اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت ایک بیٹے کی دعا کی تھی، اسی دعاء کے جواب میں انھیں یہ بشارت دی گئی کہ ان کے یہاں ایک حلیم لڑکا پیدا ہوگا، اور پھر اسی لڑکے کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو اسے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ سارا سلسلۂ واقعات بتا رہا ہے کہ وہ لڑکا حضرت ابراہیمؑ کا پہلا بیٹا تھا، ادھر یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں، اور حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے دوسرے صاحبزادے ہیں، اس کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔

(۴) یہ بات بھی تقریباً طے شدہ ہے کہ بیٹے کی قربانی کا یہ واقعہ مکہ مکرمہ کے آس پاس پیش آیا ہے، اسی لئے اہل عرب میں برابر حج کے دوران قربانی کا طریقہ رائج رہا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کے فدیہ میں جو مینڈھا جنت سے بھیجا گیا اس کے سینگ سالہا سال تک کعبہ شریف کے اندر لٹکے رہے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تائید میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، اور حضرت عامر شعبیؒ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ "میں نے اس مینڈھے کے سینگ کعبہ میں خود دیکھے ہیں" (ابن کثیر، ص ۸ ج ۴) اور حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ "اس مینڈھے کے سینگ مسلسل کعبہ میں لٹکے رہے، یہاں تک کہ جب (حجاج بن یوسف کے زمانہ میں) کعبۃ اللہ میں آتشزدگی ہوئی تو یہ سینگ بھی جل گئے" (ایضاً، ص، ج ۲) اب ظاہر ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تشریف فرما رہے ہیں، نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام، اس لئے صاف ظاہر ہے کہ ذبح کا حکم حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی سے متعلق تھا، نہ کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام سے۔

رہیں وہ روایات جن میں مختلف صحابہؓ و تابعینؒ کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام کو قرار دیا، سو اُن کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے

لکھا ہے کہ :-

اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن بظاہر یہ سارے اقوال کعب الاحبارؒ سے ماخوذ ہیں، اس لئے کہ جب وہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسلام لائے تو حضرت عمرؓ کو اپنی پرانی کتابوں کی باتیں سُنانے لگے، بعض اوقات حضرت عمرؓ ان کی باتیں سُن لیتے تھے، اس سے اور لوگوں کو بھی گنجائش ملی، اور انھوں نے بھی ان کی روایات سُن کر انھیں نقل کرنا شروع کر دیا، ان روایات میں ہر طرح کی رطب و یابس باتیں جمع تھیں، اور اس امت کو ان باتوں میں سے ایک حرف کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

(تفسیر ابن کثیرؒ، ص ۱۷ ج ۴)

حافظ ابن کثیرؒ کی یہ بات بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دینے کی بنیاد اسرائیلی روایات ہی پر ہے، اسی لئے یہود و نصاریٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں، موجودہ بائبل میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے :-

"ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اُسے کہا اے ابرہام! اس نے کہا میں حاضر ہوں، تب اُس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا"

(پیدائش ۲۲ : ۱ و ۲)

اس میں ذبح کا واقعہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، لیکن اگر انصاف سے اور تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں یہودیوں نے اپنے روایتی تعصب سے کام لے کر تورات کی عبارت میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے، اس لئے کہ کتاب پیدائش کی مذکورہ عبارت ہی میں "جو تیرا اکلوتا ہے" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو جس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا، اسی باب میں آگے چل کر پھر لکھا ہے کہ :-

"تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا" (پیدائش ۲۲ : ۱۲)

اس جملے میں بھی یہ تصریح موجود ہے کہ وہ بیٹا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا تھا، اِدھر یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ان کے اکلوتے بیٹے نہ تھے، اگر "اکلوتے" کا اطلاق کسی پر ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں، خود کتاب پیدائش ہی کی دوسری کئی عبارتیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش حضرت اسحٰق علیہ السلام

سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ملاحظہ فرمائیے :-

"اور ابرام کی بیوی سارائی کے کوئی اولاد نہ ہوئی، اس کی ایک مصری لونڈی تھی، جس کا نام ہاجرہ تھا، اور سارائی نے ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی... اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔ اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا"

(پیدائش باب ۱۶ آیات ۱ و ۳ و ۱۰ و ۱۶)

نیز اگلے باب میں لکھا ہے :

"اور خدا نے ابرام سے کہا کہ سارائی جو تیری بیوی ہے — اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا... تب ابرہام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہوگا، اور کیا سارہ کے جو نوے برس کی ہے اولاد ہوگی؟ اور ابرہام نے خدا سے کہا کہ کاش! اسمٰعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے، تب خدا نے فرمایا کہ بیشک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا، تو اس کا نام اضحاق رکھنا" (پیدائش ۱۷ : ۱۵ تا ۲۰)

اس کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے :

"اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا" (پیدائش ۲۱ : ۵)

ان عبارتوں سے صاف واضح ہے کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے چودہ سال چھوٹے تھے، اور اس چودہ سال کے عرصہ میں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے تھے، اس کے برعکس حضرت اسحٰق علیہ السلام پر ایسا کوئی وقت نہیں گذرا جس میں وہ اپنے والد کے اکلوتے ہوں، اب اس کے بعد جب کتاب پیدائش کے بائیسویں باب میں بیٹے کی قربانی کا ذکر آتا ہے، تو اس میں "اکلوتا" کا لفظ صاف شہادت دے رہا ہے کہ اس سے مراد اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور کسی یہودی نے اس کے ساتھ "اضحاق" کا لفظ محض اس لئے بڑھا دیا ہے تاکہ یہ فضیلت بنو اسمٰعیل کے بجائے بنو اسحٰق کو حاصل ہو۔

اس کے علاوہ بائبل کی اسی کتاب پیدائش میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی خوش خبری دی گئی ہے وہاں یہ بھی مذکور ہے کہ :-

"یقیناً میں اسے (یعنی حضرت اسحٰقؑ کو) برکت دوں گا کہ قومیں اس کی نسل سے ہوں گی" (پیدائش ۱۷ : ۱۶)

اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کے بارے میں اس کی پیدائش سے پہلے ہی یہ خبر دی جا چکی ہو کہ وہ صاحبِ اولاد ہوگا، اور "قومیں اس کی نسل سے ہوں گی" اس کو قربان کرنے کا حکم

کیسے دیا جاسکتا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم حضرت اسحٰق علیہ السلام سے متعلق نہیں تھا، بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے متعلق تھا۔

بائبل کی ان عبارتوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیرؒ کا یہ خیال کس قدر صحیح ہے کہ:۔

"یہودیوں کی کتب مقدسہ میں تصریح ہے کہ جب اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال تھی، اور جب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی عمر سو سال تھی، اور انہی کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اکلوتے بیٹے کے ذبح کا حکم دیا تھا، اور ایک اور نسخہ میں "اکلوتے" کے بجائے "پہلوٹھے" کا لفظ ہے، بس یہودیوں نے یہاں "اسحٰق" کا لفظ اپنی طرف سے بہتان بڑھادیا، اور اس کو درست قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے، کیونکہ یہ خود ان کی کتابوں کی تصریحات کے خلاف ہے اور یہ لفظ انھوں نے اس لئے بڑھایا کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام اُن کے جدّ امجد ہیں، اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام عربوں کے، پس یہودیوں نے حسد کی وجہ سے یہ لفظ بڑھا دیا، اور اب "اکلوتے" کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ وہ بیٹا جس کے سوا اس وقت کوئی اور تمہارے پاس موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور اُن کی والدہ اس وقت وہاں نہیں تھیں (اس لئے حضرت اسحٰقؑ کو اس معنی میں اکلوتا کہا جاسکتا ہے) لیکن یہ بالکل غلط تاویل ہے اور باطل تحریف ہے، اس لئے کہ اکلوتا اس بیٹے کو کہتے ہیں جس کے باپ کا اُس کے سوا کوئی بیٹا نہ ہو" (تفسیر ابن کثیرؒ ص ۱۴ ج ۴)

حافظ ابن کثیرؒ ہی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ علماء یہود میں سے ایک شخص حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں مسلمان ہوگیا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس سے پوچھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے کون سے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا؟ تو اس نے کہا کہ "خدا کی قسم! امیر المومنین! وہ اسمٰعیل علیہ السلام تھے، یہودی اس بات کو خوب جانتے ہیں، لیکن وہ آپ عرب لوگوں سے حسد کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں" (ص ۱۸ ج ۴)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے۔ واللہ سبحانہ اعلم

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (ان دونوں کی نسل میں بعض اچھے

بھی ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو صریح اپنا نقصان کر رہے ہیں) اس آیت کے ذریعہ یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید کر دی گئی ہے کہ ان حضرات انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہونا ہی انسان کی فضیلت اور نجات کے لئے کافی ہے۔ اس آیت نے وضاحت کے ساتھ بتادیا کہ کسی نیک انسان کے نسبی تعلق نجات کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کا اصل مدار انسان کے اپنے عقائد اور اعمال پر ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ

اور ہم نے احسان کیا موسیٰ اور ہارون پر، اور بچادیا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو

الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا

اس بڑی گھبراہٹ سے، اور ان کی ہم نے مدد کی تو رہے وہی غالب۔ اور ہم نے دی انکو

الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا

کتاب واضح، اور سجھائی ان کو سیدھی راہ، اور باقی رکھا

عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ

اُن پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم یوں دیتے ہیں

نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔ تحقیق وہ دونوں ہیں ہمارے ایماندار بندوں میں۔

خُلاصۂ تفسیر

اور ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر بھی احسان کیا (کہ ان کو نبوت اور دیگر کمالات عطا فرمائے) اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) کو بڑے غم سے (یعنی فرعون کی جانب سے پہنچائی جانے والی تکالیف سے) نجات دی اور ہم نے ان سب کی (فرعون کے مقابلے میں) مدد کی، سو (آخر میں) یہی لوگ غالب آگئے (کہ فرعون کو غرق کردیا گیا، اور یہ صاحب حکومت ہوگئے) اور ہم نے (فرعون کے غرق ہونے کے بعد) اُن دونوں (صاحبوں) کو (یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اصالۃً اور ہارون علیہ السلام کو تبعاً) واضح کتاب دی (مراد تورات ہے کہ اس میں احکام واضح طور پر مذکور تھے) اور ہم نے ان کو سیدھے رستہ پر قائم رکھا، (جس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انہیں نبی معصوم بنایا) اور ہم نے ان دونوں کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں

(مدت ہائے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام (چنانچہ دونوں حضرات کے ناموں کے ساتھ آج تک علیہ السلام کہا جاتا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں، (کہ ان کو ثنا اور دعا کا مستحق بنا دیتے ہیں) بیشک وہ دونوں ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے (اس لئے صلہ بھی کامل عطا ہوا)۔

معارف و مسائل

ان آیتوں میں تیسرا واقعہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا بیان کیا گیا ہے یہ واقعہ متعدد مقامات پر تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے، یہاں اس کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے، اور اسے ذکر کرنے سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور اطاعت شعار بندوں کی کس طرح مدد فرماتے ہیں، اور انہیں کیسے کیسے انعامات سے نوازتے ہیں چنانچہ یہاں حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ پر اپنے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے، انعامات کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک مثبت انعامات، یعنی فائدے پہنچانا، وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ میں اسی قسم کے انعامات کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے منفی انعامات، یعنی نقصان سے بچانا، اگلی آیات میں اسی قسم کی تفصیل ہے۔ آیات کا مفہوم خلاصۂ تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے۔

وَاِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور تحقیق الیاس ہے رسولوں میں۔ جب اس نے کہا اپنی قوم کو کیا تم کو ڈر نہیں،

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ

کیا تم پکارتے ہو بعل کو اور چھوڑتے ہو بہتر بنانے والے کو۔ جو اللہ ہے رب تمہارا

وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا، پھر اس کو جھٹلایا سو وہ آنے والے ہیں پکڑے ہوئے،

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۲۹﴾

مگر جو بندے ہیں اللہ کے چنے ہوئے۔ اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں کہ

سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

سلام ہے الیاسین پر۔ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۲﴾

وہ ہے ہمارے ایمان دار بندوں میں۔

خلاصۂ تفسیر

اور الیاس (علیہ السلام) بھی (بنی اسرائیل کے) پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے) جبکہ انھوں نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے (کہ وہ بت پرستی میں مبتلا تھی) فرمایا کہ کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ کیا تم بعل کو (جو ایک بت کا نام تھا) پوجتے ہو اور اس (کی عبادت) کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے (کیونکہ اور لوگ تو صرف بعض اشیاء کی تحلیل و ترکیب پر قدرت رکھتے ہیں اور وہ بھی عارضی، اور وہ تمام اشیاء کو عدم سے وجود میں لانے پر قدرت ذاتی رکھتا ہے، پھر کوئی دوسرا جان نہیں ڈال سکتا اور وہ جان ڈالتا ہے اور وہ) معبود برحق ہے (اور) تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب ہے، سو ان لوگوں نے (اس توحید کے دعوے میں) اُن کو جھٹلایا، سو (اس جھٹلانے کی شامت میں) وہ لوگ (عذاب آخرت میں) پکڑے جاویں گے، مگر جو اللہ کے خاص بندے (یعنی ایمان والے) تھے (وہ ثواب و اجر میں ہوں گے) اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں (مدتہائے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ الیاسین پر (کہ یہ بھی الیاس علیہ السلام کا نام ہے) سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ ان کو ثناء اور دعا کا مستحق بناتے ہیں) بیشک وہ ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے۔

معارف و مسائل

حضرت الیاس علیہ السلام

ان آیات میں چوتھا واقعہ حضرت الیاس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ آیات کی تفسیر سے قبل حضرت الیاس علیہ السلام سے متعلق چند معلومات درج ذیل ہیں:-

قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر صرف دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورۂ انعام میں اور دوسرے سورۂ صافات کی انہی آیتوں میں۔ سورۂ انعام میں تو صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں آپ کا اسم گرامی شمار کر دیا گیا ہے اور کوئی واقعہ مذکور نہیں، البتہ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی دعوت و تبلیغ کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔

چونکہ قرآن کریم میں حضرت الیاس علیہ السلام کے حالات تفصیل سے مذکور نہیں ہیں،

اور نہ مستند احادیث میں آپ کے حالات آئے ہیں، اس لئے آپ کے بارے میں کتب تفسیر کے اندر مختلف اقوال اور متفرق روایات ملتی ہیں، جن میں سے بیشتر بنی اسرائیل کی روایات سے ماخوذ ہیں۔

مفسرین میں سے ایک مختصر گروہ کا کہنا یہ ہے کہ "الیاس" حضرت ادریس علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، اور ان دونوں شخصیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام میں کوئی فرق نہیں ہے (درمنثور ص ۲۸۵، ۲۸۶ ج ۵) لیکن محققین نے ان اقوال کی تردید کی ہے۔ قرآن کریم نے بھی حضرت ادریس اور حضرت الیاس علیہما السلام کا اس طرح جدا جدا تذکرہ فرمایا ہے، کہ دونوں کو ایک قرار دینے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، اس لئے حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ دونوں الگ الگ رسول ہیں (البدایہ والنہایہ، ص ۳۳۹ ج ۱)

بعثت کا زمانہ اور مقام

قرآن وحدیث سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ حضرت الیاس علیہ السلام کب اور کہاں مبعوث ہوئے تھے، لیکن تاریخی اور اسرائیلی روایات اس بات پر تقریباً متفق ہیں کہ آپ حضرت حزقیل علیہ السلام کے بعد اور حضرت الیسع علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے جانشینوں کی بدکاری کی وجہ سے بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی تھی، ایک حصہ یہوداہ یا یہودیہ کہلاتا تھا، اور اس کا مرکز بیت المقدس تھا، اور دوسرا حصہ اسرائیل کہلاتا تھا اور اس کا پایۂ تخت سامرہ (موجودہ نابلس) تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام اردن کے علاقہ جلعاد میں پیدا ہوئے تھے، اُس وقت اسرائیل کے ملک میں جو بادشاہ حکمران تھا اس کا نام بائبل میں اخی آب اور عربی تواریخ وتفاسیر میں اجب یا اخب مذکور ہے۔ اس کی بیوی ایزبل، بعل نامی ایک بت کی پرستار تھی، اور اسی نے اسرائیل میں بعل کے نام پر ایک بڑی قربان گاہ تعمیر کرکے تمام بنو اسرائیل کو بت پرستی کے راستہ پر لگا دیا تھا۔ حضرت الیاس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ اس خطے میں جاکر توحید کی تعلیم دیں، اور اسرائیلیوں کو بت پرستی سے روکیں (ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر ص ۵۳، ج ۲۳ وابن کثیر ص ۱۹ ج ۴ وتفسیر مظہری ص ۱۳۴ ج ۸ اور بائبل کی کتاب سلاطین اوّل ۱۶: ۲۹ تا ۳۳ و ۱۷: ۱)

قوم کے ساتھ کشمکش

دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت الیاس علیہ السلام کو بھی اپنی قوم کے ساتھ شدید کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ قرآن کریم چونکہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے، اس لئے اس نے اس کشمکش کا مفصل حال بیان کرنے کے بجائے صرف اتنی بات بیان فرمائی ہے جو عبرت وموعظت حاصل کرنے کے لئے ضروری تھی، یعنی یہ کہ ان کی قوم نے اُن کو جھٹلایا اور چند مخلص بندوں کے سوا کسی نے حضرت الیاس

علیہ السلام کی بات نہ مانی، اس لئے آخرت میں انہیں ہولناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

بعض مفسرین نے یہاں اس کشمکش کے مفصل حالات بیان فرمائے ہیں، مروجہ تفاسیر میں حضرت الیاس علیہ السلام کا سب سے بسوط تذکرہ تفسیر مظہری میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے کیا گیا ہے، اس میں جو واقعات مذکور ہیں وہ تقریباً تمام تر بائبل سے ماخوذ ہیں، دوسری تفسیروں میں بھی ان واقعات کے بعض اجزاء حضرت وہب بن منبہؒ اور کعب الاحبارؒ وغیرہ کے حوالہ سے بیان ہوئے ہیں جو اکثر اسرائیلی روایات نقل کرتے ہیں۔

ان تمام روایات سے خلاصہ کے طور پر جو قدر مشترک نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب اور اس کی رعایا کو بعل نامی بت کی پرستش سے روک کر توحید کی دعوت دی، مگر دو ایک حق پسند افراد کے سوا کسی نے آپ کی بات نہیں مانی، بلکہ آپ کو طرح طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اخی اب اور اس کی بیوی ایزبل نے آپ کو شہید کرنے کے منصوبے بنائے۔ آپ نے ایک دور افتادہ غار میں پناہ لی، اور عرصۂ دراز تک وہیں مقیم رہے، اس کے بعد آپ نے دعاء فرمائی، کہ اسرائیل کے لوگ قحط سالی کا شکار ہوجائیں، تاکہ اس قحط سالی کو دور کرنے کے لئے آپ اُن کو معجزات دکھائیں تو شاید وہ ایمان لے آئیں، چنانچہ انھیں شدید قحط میں مبتلا کردیا گیا۔

اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اخی آب سے ملے، اور اس سے کہا کہ یہ عذاب اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے ہے، اور اگر تم اب بھی باز آجاؤ تو یہ عذاب دور ہوسکتا ہے۔ میری سچائی کے امتحان کا بھی یہ بہترین موقع ہے، تم کہتے ہو کہ اسرائیل میں تمہارے معبود بعل کے ساڑھے چار سو نبی ہیں، تم ایک دن اُن سب کو میرے سامنے جمع کرلو، وہ بعل کے نام پر قربانی پیش کریں، اور میں اللہ کے نام پر قربانی کروں گا، جس کی قربانی کو آسمانی آگ آکر بھسم کردے گی، اس کا دین سچا ہوگا، سب نے اس تجویز کو خوشی سے مان لیا۔

چنانچہ کوہ کرمل کے مقام پر یہ اجتماع ہوا، بعل کے جھوٹے نبیوں نے اپنی قربانی پیش کی، اور صبح سے دوپہر تک بعل سے التجائیں کرتے رہے، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اس کے بعد حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی، اس پر آسمان سے آگ نازل ہوئی، اور اس نے حضرت الیاس علیہ السلام کی قربانی کو بھسم کردیا، یہ دیکھ کر بہت سے لوگ سجدے میں گر گئے، اور اُن پر حق واضح ہوگیا، لیکن بعل کے جھوٹے نبی اب بھی نہ مانے، اس لئے حضرت الیاس علیہ السلام نے ان کو وادیٔ قیشون میں قتل کرادیا۔

اس واقعہ کے بعد موسلا دھار بارش بھی ہوئی، اور پورا خطہ پانی سے نہال ہوگیا، لیکن

اخی آپ کی بیوی ایزبل کی اب بھی آنکھ نہ کھلی، وہ حضرت الیاس علیہ السلام پر ایمان لانے کے بجائے اُلٹی ان کی دشمن ہوگئی، اور اس نے آپ کو قتل کرانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ حضرت الیاس علیہ السلام یہ سُنکر پھر سامریہ سے روپوش ہوگئے، اور کچھ عرصہ کے بعد بنی اسرائیل کے دوسرے ملک یہودیہ میں تبلیغ شروع کر دی، کیونکہ رفتہ رفتہ بعل پرستی کی وبا وہاں بھی پھیل چکی تھی۔ وہاں کے بادشاہ یہورام نے بھی آپ کی بات نہ سُنی، یہاں تک کہ وہ حضرت الیاس علیہ السلام کی پیشینگوئی کے متعلق تباہ و برباد ہوا چند سال بعد آپ دوبارہ اسرائیل تشریف لائے اور یہاں پھر اخی آب اور اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی، مگر وہ بدستور اپنی بداعمالیوں میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ انھیں بیرونی حملوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بنا دیا گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو واپس بُلا لیا۔

کیا حضرت الیاس علیہ السلام حیات ہیں؟

مؤرخین اور مفسرین کے درمیان یہاں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا چکے؟ تفسیر مظہری میں علامہ بغویؒ کے حوالہ سے جو طویل روایت بیان کی گئی ہے اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کو ایک آتشیں گھوڑے پر سوار کر کے آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا تھا، اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ ہیں (مظہری ص ۴۱ ج ۸) علامہ سیوطیؒ نے بھی ابن عساکرؒ اور حاکمؒ وغیرہ کے حوالہ سے کئی روایات ایسی نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ کعب الاحبارؒ سے منقول ہے کہ چار انبیاء علیہم السلام اب تک زندہ ہیں، دو زمین میں، حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ اور دو آسمان میں، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت ادریس علیہم السلام، (در منثور، ص ۲۸۵، ۲۸۶ ج ۵) یہاں تک کہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام ہر سال رمضان کے مہینہ میں بیت المقدس میں جمع ہوتے ہیں، اور روزے رکھتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی، ص ۱۶ ج ۱۵)

لیکن حافظ ابن کثیرؒ جیسے محقق علماء نے ان روایات کو صحیح قرار نہیں دیا، وہ اِن جیسی روایتوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

وھو من الاسرائیلیات التی لا تصدق ولا تکذب بل الظاھر أن صحتھا بعیدۃ، (البدایۃ والنہایۃ، ص ۳۳۸ ج ۱)

"یہ ان اسرائیلی روایتوں میں سے ہے جن کی نہ تصدیق کی جاتی ہے نہ تکذیب، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اُن کی صحت بعید ہے"

نیز فرماتے ہیں:۔

"ابن عساکر نے کئی روایتیں اُن لوگوں کی نقل کی ہیں جو حضرت الیاس علیہ السلام سے ملے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قابلِ اطمینان نہیں، یا تو اس لئے کہ ان کی

سند ضعیف ہے، یا اس لئے کہ جن اشخاص کی طرف یہ واقعات منسوب کئے گئے ہیں وہ مجہول ہیں" (البدایۃ والنہایۃ، ص ۳۳۹ ج ۱)

ظاہر یہی ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کے رفعِ آسمانی کا نظریہ اسرائیلی روایات ہی سے ماخوذ ہے، بائبل میں لکھا ہے کہ:۔

"اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھو ایک آتشی رتھ اور آتشی گھوڑوں نے ان دونوں کو جُدا کر دیا اور ایلیاہ بگولے میں آسمان پر چلا گیا" (۲۔ سلاطین ۲: ۱۱)

اسی وجہ سے یہودیوں میں یہ عقیدہ پیدا ہوا تھا کہ حضرت الیاس علیہ السلام دوبارہ زمین پر تشریف لائیں گے، چنانچہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو انھوں نے اُن پر الیاس علیہ السلام ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ انجیل یوحنا میں ہے:

"انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اُس نے کہا میں نہیں ہوں" (یوحنا ۱: ۲۱)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کعب الاحبارؒ اور وہب بن منبہؒ جیسے علماء نے جو اہلِ کتاب کے علوم کے ماہر تھے، یہی روایتیں مسلمانوں کے سامنے بیان کی ہوں گی جن سے حضرت الیاس علیہ السلام کی زندگی کا نظریہ بعض مسلمانوں میں بھی پھیل گیا، ورنہ قرآن یا حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے جس سے حضرت الیاس علیہ السلام کی زندگی یا آپ کا آسمان پر اُٹھایا جانا ثابت ہوتا ہو، صرف ایک روایت مستدرک حاکمؒ میں ملتی ہے، جس میں مذکور ہے کہ تبوک کے راستے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت الیاس علیہ السلام سے ہوئی۔ لیکن یہ روایت بتصریح محدثین موضوع ہے، حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں:۔

بل ھو موضوع قبح اللہ من وضعہ وما کنت احسب ولا أجوز ان الجھل یبلغ بالحاکم الی ان یصحح ھذا (در منثور، ص ۲۸۶ ج ۵)

"بلکہ یہ حدیث موضوع ہے، خدا قبح کرے اس شخص کا جس نے یہ حدیث وضع کی، اس سے پہلے میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ امام حاکمؒ کی بیخبری اس حد تک پہنچ سکتی ہو کہ وہ اس حدیث کو صحیح قرار دیں"

خلاصہ یہ کہ حضرت الیاس علیہ السلام کا زندہ ہونا کسی معتبر اسلامی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس میں سکوت اختیار کیا جائے، اور

لہ واضح رہے کہ بائبل میں حضرت الیاس علیہ السلام کا نام ایلیاہ مذکور ہے۔

اسرائیلی روایات کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر عمل کیا جائے کہ "نہ اُن کی تصدیق کرو نہ تکذیب"۔ کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر اور عبرت و موعظت کا مقصد اس کے بغیر بھی پوری طرح حاصل ہو جاتا ہے، واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم، اب آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے:۔

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا، (کیا تم بعل کو پوجتے ہو) بعل کے لغوی معنی شوہر اور مالک وغیرہ ہیں، لیکن یہ اُس بت کا نام تھا جسے حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم نے اپنا معبود بنایا ہوا تھا۔ بعل کی پرستش کی تاریخ بہت قدیم ہے، شام کے علاقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس کی پرستش ہوتی تھی، اور یہ اُن کا سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی کے نام سے موسوم ہوا، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہل حجاز کا مشہور بت ہُبل بھی یہی بعل ہے۔

(قصص القرآن، ص ۲۸ ج ۲)

وَتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ (اور اس کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے) اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور "احسن الخالقین" (سب سے اچھا خالق) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ کوئی دوسرا بھی خالق ہو سکتا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جن جھوٹے معبودوں کو تم نے خالق قرار دیا ہوا ہے وہ ان سب سے اونچی شان والا ہے۔ (قرطبی) اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں "خالق" "صانع" (بنانے والا) کے معنے میں استعمال ہوا ہے، یعنی وہ تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے، اس لئے کہ دوسرے صناع صرف اتنا ہی تو کرتے ہیں کہ مختلف اجزاء کو جوڑ کر کوئی چیز تیار کر لیتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا ان کے بس سے باہر ہے، اور اللہ تعالیٰ معدوم اشیاء کو وجود بخشنے پر قدرتِ ذاتی رکھتا ہے (بیان القرآن)

خبر اللہ کی طرف تخلیق کی صفت منسوب کرنا جائز نہیں

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ "خلق" کے معنی پیدا کرنے کے ہیں، جس کا مطلب ہو کسی شے کو عدم محض سے قدرتِ ذاتی کے بل پر وجود میں لانا۔ اس لئے یہ صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی اور کی طرف اس کی نسبت جائز نہیں، لہٰذا ہمارے زمانے میں جو رواج چل پڑا ہے کہ اہل قلم کے مضامین، شاعروں کے شعر اور مصوّروں کی تصویروں کو اُن کی "تخلیقات" کہہ دیا جاتا ہے وہ بالکل جائز نہیں، اور نہ اہل قلم کو ان مضامین کا خالق کہنا درست ہے۔ خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اُن کے رشحاتِ قلم کو "کاوش" یا "مضمون" وغیرہ کہنا چاہئے "تخلیق" نہیں۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ (سو اُن لوگوں نے اُن کو جھٹلایا سو وہ پکڑے جائیں گے) مطلب یہ ہے کہ انھیں اللہ کے بھیجے رسول کو جھٹلانے کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ اس سے آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے اور دنیا کا انجام بد بھی۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کی

تکذیب کے نتیجے میں یہوداہ اور اسرائیل دونوں ملکوں کے حکمرانوں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا، اس تباہی کی تفصیل تفسیر مظہری میں اور بائبل کی کتاب سلاطین اوّل باب ۲۲ سلاطین دوم باب اوّل اور تواریخ دوم باب ۲۱ میں موجود ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ، یہاں "مخلصین" (لام پر زبر ہے) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں "خالص کئے ہوئے لوگ" یعنی وہ لوگ جنھیں اللہ نے اپنی اطاعت اور اجر و ثواب کے لئے خالص کر لیا ہو، لہٰذا اس کا ترجمہ "مخلص" کے بجائے "برگزیدہ" زیادہ مناسب ہے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ "اِلیاسین" بھی الیاس علیہ السلام ہی کا ایک نام ہے، اہل عرب اکثر عجمی ناموں کے ساتھ یاء اور نون بڑھا دیتے ہیں، جیسے "سیناء" سے "سینین" اسی طرح یہاں بھی دو حرف بڑھا دیئے گئے ہیں۔

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

اور بیشک لوط رسولوں میں سے ۔ جب بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے سارے گھر والوں کو،

اِلَّا عَجُوْزًا فِى الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ

مگر ایک بڑھیا کہ رہ گئی رہ جانے والوں میں ۔ پھر جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہم نے دوسروں کو، اور تم گذرتے ہو

لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اُن پر صبح کے وقت، اور رات کو بھی ۔ پھر کیا نہیں سمجھتے؟

خُلاصۂ تفسیر

اور بیشک لوط (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا قصہ قابلِ ذکر ہے) جب کہ ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی بجز اس بڑھیا (یعنی ان کی بیوی) کے کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لوط اور ان کے اہل کے سوا تھے) ہلاک کر دیا (جن کا قصہ کئی جگہ آچکا ہے) اور (اے اہل مکہ) تم تو اُن کے (دیار و مساکن پر سفر شام میں کبھی) صبح ہوتے اور (کبھی) رات میں گزر کیا کرتے ہو (اور آثار بربادی دیکھتے ہو) تو کیا (اس کو دیکھ کر) پھر بھی نہیں سمجھتے ہو (کہ کفر کا کیا انجام ہوا، اور جو آئندہ کفر کرے گا اس کے لئے بھی یہی اندیشہ ہے)۔

معارف ومسائل

ان آیات میں پانچواں واقعہ حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ واقعہ پیچھے کئی مقامات پر گذر چکا ہے، اس لئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اہل مکہ کو خاص طور پر یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تم شام کے تجارتی سفر میں سدوم کے اس علاقہ سے دن رات گذرتے ہو، جہاں یہ عبرتناک واقعہ پیش آیا، لیکن اس سے کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔ صبح اور رات کا ذکر خاص طور سے اس لئے فرمایا گیا کہ اہل عرب عموماً انہی اوقات میں یہاں سے گذرا کرتے تھے، اور قاضی ابوالسعودؒ فرماتے ہیں کہ غالباً سدوم کا یہ علاقہ راستے کی ایسی منزل پر واقع تھا کہ یہاں سے کوچ کرنے والے صبح کے وقت روانہ ہوتے تھے اور آنے والے شام کے وقت آتے تھے (تفسیر ابی السعود)

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾

اور تحقیق یونس ہے رسولوں میں سے ۔ جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ

پھر قرعہ ڈلوایا تو نکلا خطاوار ۔ پھر لقمہ کیا اس کو مچھلی نے اور وہ

مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ

الزام کھایا ہوا تھا۔ پھر اگر نہ ہوتی یہ بات کہ وہ یاد کرتا تھا پاک ذات کو ، تو رہتا اسی کے پیٹ میں جس

اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا

دن تک کہ مُردے زندہ ہوں ۔ پھر ڈالا ہم نے اس کو چٹیل میدان میں اور وہ بیمار تھا ۔ اور اگایا ہم نے

عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ

اس پر ایک درخت بیل والا ، اور بھیجا اس کو لاکھ آدمیوں پر یا

يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

اس سے زیادہ ۔ پھر وہ یقین لائے پھر ہم نے فائدہ اٹھانے دیا انکو ایک وقت تک

خلاصۂ تفسیر

اور بیشک یونس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اُس وقت کا قصہ

یاد کیجئے) جبکہ (انھوں نے اپنی قوم سے ایمان نہ لانے پر بحکم الٰہی عذاب کی پیشگوئی کی، اور خود وہاں سے چلے گئے اور جب متعین وقت پر عذاب کے آثار نمودار ہونے لگے تو قوم کو ایمان لانے کی غرض سے یونس علیہ السلام کی تلاش ہوئی، جب وہ نہ ملے تو سب نے متفق ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کی اور اجمالی طور پر ایمان لے آئے، اور وہ عذاب ٹل گیا، یونس علیہ السلام کو کسی ذریعہ سے یہ خبر معلوم ہوئی تو شرمندگی کی وجہ سے اپنے اجتہاد سے اللہ تعالیٰ کی صریح اجازت کے بغیر کہیں دور چلے جانے کا ارادہ کر کے اپنی جگہ سے) بھاگ کر (چلے، راہ میں دریا تھا، اس میں مسافروں سے بھری ہوئی کشتی تھی، اس) بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے (کشتی چلی تو طوفان آیا، کشتی والے کہنے لگے کہ ہم میں کوئی نیا قصوروار ہے، اس کو کشتی سے علیحدہ کرنا چاہئے، اس شخص کو متعین کرنے کے لئے سب کا اتفاق اس پر ہوا کہ قرعہ ڈالا جائے) سو یونس (علیہ السلام) بھی شریک قرعہ ہوئے تو (قرعہ میں) یہی ملزم ٹھہرے (یعنی انہی کا نام نکلا، پس انھوں نے اپنے کو دریا میں ڈال دیا۔ شاید کنارہ قریب ہوگا، شناوری کر کے کنارہ پر جا پہنچنے کا ارادہ ہوگا، پس شبہ خودکشی کا لازم نہیں آتا) پھر (جب دریا میں گرے تو ہمارے حکم سے) ان کو مچھلی نے (نابت) نگل لیا اور یہ (اس وقت) اپنے کو (اس اجتہادی غلطی پر) ملامت کر رہے تھے (یہ تو دل سے توبہ ہوئی اور زبان سے بھی توحید وتسبیح کے ساتھ استغفار کر رہے تھے، جیسا دوسری آیت میں ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) سو اگر وہ (اس وقت) تسبیح (واستغفار) کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی کے پیٹ میں رہتے (مطلب یہ کہ پیٹ سے نکلنا میسر نہ ہوتا، بلکہ اس کی غذا بنا دیئے جاتے) سو (چونکہ انھوں نے تسبیح اور توبہ کی اس لئے) ہم نے (ان کو اس سے محفوظ رکھا اور مچھلی کے پیٹ سے نکال کر) ان کو ایک میدان میں ڈال دیا (یعنی مچھلی کو حکم دیا کہ کنارے پر اگل دے) اور وہ اس وقت مضمحل تھے (کیونکہ مچھلی کے پیٹ میں کافی ہوا اور غذا نہ پہونچتی تھی) اور ہم نے (دھوپ سے بچانے کے لئے) اُن پر ایک بیلدار درخت بھی اُگا دیا تھا اور کوئی پہاڑی بکری انھیں دودھ پلا جاتی تھی) اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف (شہر نینوا میں موصل کے قریب) پیغمبر بنا کر بھیجا تھا، پھر وہ لوگ ایمان لے آئے تھے (آثار عذاب دیکھ کر اجمالاً اور مچھلی کے واقعہ کے بعد حضرت یونس علیہ السلام وہاں دوبارہ تشریف لے گئے اس وقت تفصیلاً) تو (ایمان کی برکت سے) ہم نے اُن کو ایک زمانہ تک (یعنی مدت عمر تک خیر وخوبی سے) عیش دیا۔

معارف ومسائل

اس سورۃ میں آخری واقعہ حضرت یونس علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اور

اس کی متعلقہ تفصیلات سورۂ یونس کے آخر میں گذر چکی ہیں (دیکھئے معارف القرآن ص ۵۰۵، ج ۴) اور ان کا خلاصہ اوپر خلاصۂ تفسیر میں بھی آگیا ہے، اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، البتہ خاص ان آیتوں کے بارے میں چند ضروری باتیں درج ذیل ہیں:۔

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ، بعض مفسرین اور مؤرخین نے اس پر بحث کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے واقعہ سے پہلے ہی رسول بنا دیئے گئے تھے یا بعد میں بنائے گئے؟ بعض حضرات کا خیال ہو کہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انھیں رسول بنایا گیا، لیکن قرآن کریم کے ظاہری اسلوب اور بیشتر روایات سے یہی راجح ہے کہ آپ کو پہلے ہی منصب رسالت پر فائز کر دیا گیا تھا، مچھلی کا واقعہ بعد میں پیش آیا۔

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (جب کہ وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کی طرف) لفظ اَبَقَ اِبَاقٌ سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں کسی غلام کا اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جانا۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کے لئے اس وجہ سے استعمال فرمایا کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف سے وحی کا انتظار کئے بغیر روانہ ہوگئے تھے۔ انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہوتے ہیں اور انکی معمولی سی لغزش بھی بڑی گرفت کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے یہ سخت لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

فَسَاهَمَ (پس وہ شریک قرعہ اندازی ہوئے) یہ قرعہ اندازی اُس وقت کی گئی جبکہ کشتی بیچ دریا کے پہنچ کر طوفان میں گھر گئی، اور وزن کی زیادتی سے اس کے ڈوبنے کا اندیشہ ہوگیا، اور طے یہ پایا کہ ایک شخص کو دریا میں پھینک دیا جائے، قرعہ یہ متعین کرنے کے لئے ڈالا گیا کہ وہ شخص کون ہے!

قرعہ اندازی کا حکم یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ نہ کسی کا حق ثابت کیا جاسکتا ہو نہ کسی کو مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرعہ کے ذریعہ کسی کو چور ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اگر دو آدمیوں میں یہ اختلاف ہو کہ فلاں جائیداد کس کی ملکیت ہے تو قرعہ کے ذریعہ اس کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، ہاں قرعہ اندازی اس موقع پر جائز بلکہ بہتر ہے جہاں ایک شخص کو شرعاً مکمل اختیار حاصل ہو کہ وہ چند جائز راستوں میں سے کسی بھی راستے کو اختیار کرلے۔ اب وہ اپنی مرضی سے کوئی راستہ متعین کرنے کے بجائے قرعہ ڈال کر فیصلہ کرے، مثلاً جس شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، اُسے سفر میں جاتے وقت یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ جس بیوی کو چاہے ساتھ لے جائے، اب وہ اپنی مرضی سے ایسا کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کرلے تو بہتر ہے، تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول تھا۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بھی قرعہ اندازی سے کسی کو مجرم ثابت کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ پوری کشتی کو بچانے کے لئے کسی کو بھی دریا میں ڈالا جاسکتا تھا، قرعہ کے

کے ذریعہ اس کی تعیین کی گئی۔

فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ (پس وہ مغلوب ہوگئے) اِدْحَاضٌ کے لغوی معنی ہیں کسی کو ناکام بنا دینا، مطلب یہ ہے کہ قرعہ اندازی میں انہی کا نام نکل آیا، اور انھوں نے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ اس پر خودکشی کا شبہ نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کنارہ قریب ہو اور وہ تیراکی ذریعے وہاں تک پہونچنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ الخ، اس آیت سے یہ سمجھنا غلط ہو کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام تسبیح نہ کرتے تو وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس مچھلی کے پیٹ ہی کو حضرت یونس علیہ السلام کی قبر بنا دیا جاتا۔

تسبیح و استغفار سے مصائب دُور ہوتے ہیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مصائب اور آفتوں کو دُور کرنے میں تسبیح اور استغفار خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سورۂ انبیاء میں گذر چکا ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تھے تو یہ کلمہ خاص طور سے پڑھتے تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ، اللہ تعالیٰ نے اسی کلمہ کی برکت سے انھیں اس آزمائش سے نجات عطا فرمائی، اور وہ مچھلی کے پیٹ سے صحیح سالم نکل آئے۔ اسی لئے بزرگوں سے یہ منقول چلا آیا ہے کہ وہ انفرادی یا اجتماعی مصیبت کے وقت یہ کلمہ سوا لاکھ مرتبہ پڑھتے ہیں، اور اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ مصیبت کو دور فرما دیتا ہے۔

ابوداؤد میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حضرت یونس علیہ السلام نے جو دعاء مچھلی کے پیٹ میں کی تھی یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ، اسے جو مسلمان بھی کسی مقصد کے لئے پڑھے گا اس کی دعاء قبول ہوگی" (تفسیر قرطبی)

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ، (پس ہم نے اُن کو میدان میں ڈال دیا اور وہ اس وقت مضمحل تھے) العراء کے معنی ہیں کھلا میدان جس میں کوئی درخت نہ ہو۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی وجہ سے انتہائی کمزور ہوگئے تھے، اور جسم پر بال بھی باقی نہ رہے تھے۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ، (اور ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت بھی اُگا دیا تھا) یقطین ہر اس درخت کو کہتے ہیں جس کا تنہ نہ ہو۔ روایات میں ہے کہ یہ کدو کی بیل تھی۔ اس درخت کو اُگانے کا منشاء یہ تھا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو سایہ حاصل ہو۔ یہاں شجرۃ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یا تو اس کدو کی بیل کو اللہ نے معجزہ کے طور پر تنہ دار بنا دیا تھا،

یا کوئی اور درخت تھا جس پر وہ بیل چڑھا دی تھی تاکہ اس سے گھنا سایہ مل سکے، ورنہ بیل سے سایہ ملنا مشکل تھا۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا تھا) یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم و خبیر ہیں، ان کو اس شک کے اظہار کی کیا ضرورت ہے کہ ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمی تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ عام لوگوں کی مناسبت سے کہا گیا ہے، یعنی ایک عام آدمی انھیں دیکھتا تو یہ کہتا کہ ان کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے کچھ اوپر ہے (مظہری) اور حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ یہاں شک کا اظہار مقصود ہی نہیں ہے، انھیں ایک لاکھ بھی کہا جا سکتا ہے، اور اس سے زیادہ بھی، اور وہ اس طرح کہ اگر کسر کا لحاظ نہ کیا جائے تو ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، اور اگر کسر کو بھی شمار کیا جائے تو ایک لاکھ سے زیادہ (بیان القرآن)

یہ جملہ چونکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد آیا ہے اس لئے اس سے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی بعثت اس واقعہ کے بعد ہوئی تھی۔ اور علامہ بغویؒ نے یہاں تک فرما دیا کہ اس آیت میں نینوا کی طرف بعثت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ مچھلی کے واقعہ کے بعد انھیں ایک دوسری امت کی طرف بھیجا گیا، جس کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، لیکن قرآن کریم اور روایات سے ان کے اس قول کی تائید نہیں ہوتی۔ یہاں حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کے شروع ہی میں آپ کی رسالت کا تذکرہ صاف بتا رہا ہے کہ مچھلی کا واقعہ رسول بننے کے بعد پیش آیا ہے، اس کے بعد یہاں اس جملے کو دوبارہ اس لئے لایا گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی تندرستی کے بعد انھیں دوبارہ وہیں بھیجا گیا تھا، یہاں یہ واضح کر دیا کہ وہ لوگ معدودے چند افراد نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد لاکھ سے بھی اوپر تھی۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (پس وہ ایمان لے آئے، سو ہم نے ان کو ایک زمانہ تک عیش دیا) "ایک زمانہ تک" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ دوبارہ کفر و شرک میں مبتلا نہیں ہوئے ان پر کوئی عذاب نہیں آیا۔

مرزا قادیانی کی تلبیس کا جواب

یہ بات سورۂ یونس کی تفسیر میں بھی واضح کی جا چکی ہے، اور اس آیت سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر سے جو عذاب ٹلا گیا وہ اس لئے کہ آپ کی قوم بروقت ایمان لے آئی تھی۔ اس سے پنجاب کے جھوٹے نبی مرزا غلام احمد قادیانی کی اس تلبیس کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ جب اس نے اپنے مخالفوں کو یہ چیلنج کیا کہ اگر وہ اسی طرح مخالفت کرتے رہے تو خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ فلاں وقت تک عذاب الٰہی آ جائے گا، لیکن مخالفین کی

جدوجہد اور تیز ہو گئی پھر بھی عذاب نہ آیا، تب ناکامی کی ذلت سے بچنے کے لئے قادیانی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ چونکہ مخالفین دل میں ڈر گئے ہیں اس لئے ان پر سے عذاب ٹل گیا، جس طرح یونس علیہ السلام کی قوم پر سے ٹل گیا تھا، لیکن قرآن کریم کی یہ آیت اس تاویل باطل کو مردود قرار دیتی ہے۔ اس لئے کہ قوم یونس علیہ السلام تو ایمان کی وجہ سے عذاب سے بچی تھی، اس کے برعکس مرزا قادیانی کے مخالفین نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لائے بلکہ ان کی مخالفانہ جدوجہد اور تیز ہو گئی۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿١٤٩﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ

اب ان سے پوچھ کیا تیرے رب کے یہاں بیٹیاں ہیں اور ان کے یہاں بیٹے، یا ہم نے بنایا فرشتوں کو

اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿١٥١﴾

عورت اور وہ دیکھتے تھے؟ سنتا ہے، وہ اپنا جھوٹ کہتے ہیں کہ

وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿١٥٢﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿١٥٣﴾

اللہ کے اولاد ہوئی، اور وہ بیشک جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے پسند کیں بیٹیاں بیٹوں سے

مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿١٥٤﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٥٥﴾ اَمْ لَكُمْ

کیا ہو گیا ہے تم کو کیسا انصاف کرتے ہو؟ کیا تم دھیان نہیں کرتے ہو، یا تمہارے پاس کوئی

سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥٦﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٥٧﴾ وَ

سند ہے کھلی؟ تو لاؤ اپنی کتاب اگر ہو تم سچے۔ اور

جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ

ٹھہرایا ہے انھوں نے خدا میں اور جنوں میں ناتا، اور جنوں کو تو معلوم ہے کہ تحقیق

لَمُحْضَرُوْنَ ﴿١٥٨﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٥٩﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ

وہ پکڑے ہوئے آئیں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بتاتے ہیں، مگر جو بندے ہیں اللہ

الْمُخْلَصِيْنَ ﴿١٦٠﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿١٦١﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ

کے چنے ہوئے۔ سو تم اور جن کو تم پوجتے ہو، کسی کو اس کے ہاتھ سے بہکا کر

بِفٰتِنِيْنَ ﴿١٦٢﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿١٦٣﴾ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ

نہیں لے سکتے، مگر اسی کو جو پہنچنے والا ہے دوزخ میں۔ اور ہم میں جو ہے اس کا

مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

ایک ٹھکانا ہے مقرر، اور ہم ہی ہیں صف باندھنے والے، اور ہم ہی ہیں پاکی بیان کرنے والے -

خُلاصۂ تفسیر

(توحید کے دلائل تو اوپر بیان ہو چکے) سو (اب اس کے بعد) ان لوگوں سے (جو ملائکہ اور جنات کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، اس طرح کہ ملائکہ کو نعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں اور جنات کے سرداروں کی بیٹیوں کو ان فرشتوں کی مائیں قرار دیتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے نسبی رشتہ ہے، اور جنات سے زوجیت کا تعلق ہے، سو ان سب سے) پوچھئے کہ کیا خدا کے لئے تو بیٹیاں (ہوں) اور تمہارے لئے بیٹے (ہوں یعنی جب اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو تو عقیدۂ مذکور میں خدا کے لئے بیٹیاں کیسے تجویز کرتے ہو۔ پس اس عقیدے میں ایک خرابی تو یہ ہے اور) ہاں (دوسری بات سنو کہ) کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ (ان کے بننے کے وقت) دیکھ رہے تھے (یعنی ایک دوسری بُرائی یہ ہے کہ فرشتوں پر بلا دلیل مؤنث ہونے کی تہمت رکھتے ہیں) خوب سن لو کہ وہ لوگ (دلیل کچھ نہیں رکھتے، بلکہ محض) سخن تراشی سے کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ صاحب اولاد ہے اور وہ یقیناً (بالکل) جھوٹے ہیں (پس اس عقیدے میں تیسری بُرائی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت لازم آتی ہے، ان میں سے پہلی بُرائی کا قبح عرف سے، دوسری کا نقل سے اور تیسری کا عقل سے ثابت ہے۔ اور چونکہ جاہلوں کے لئے عرفی بُرائی کا اثبات زیادہ مؤثر ہوتا ہے، اس لئے پہلی بُرائی کو دوسرے عنوان سے مکرر فرماتے ہیں کہ ہاں) کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں زیادہ پسند کیں؟ تم کو کیا ہو گیا تم کیسا (بیہودہ) حکم لگاتے ہو؟ (جس کو عرفاً خود بھی بُرا سمجھتے ہو) پھر (علاوہ عرف کے) کیا تم (عقل اور) سوچ سے کام نہیں لیتے ہو (کہ یہ عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے) ہاں (اگر دلیل عقلی نہیں تو) کیا تمہارے پاس (اس پر) کوئی واضح دلیل موجود ہے (اس سے مراد نقلی دلیل ہے) سو تم (اگر اس میں) سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو اور (عقیدۂ مذکورہ میں ملائکہ کو اولاد قرار دینے کے علاوہ) ان لوگوں نے اللہ میں اور جنات میں (بھی) رشتہ داری قرار دی ہے (جس کا بطلان اور بھی زیادہ ظاہر ہے۔ کیونکہ بیوی جس کام کے لئے ہوتی ہے اس سے حق تعالیٰ پاک ہے، اور جب زوجیت محال ہے تو سسرالی رشتے جو اسی سے نکلتے ہیں وہ بھی محال ہوں گے) اور (جس جس کو یہ لوگ خدا کا شریک ٹھہرا رہے ہیں ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان میں جو) جنات

(ہیں خود ان کا یہ عقیدہ ہے کہ دان میں جو کافر ہیں) وہ (عذاب میں) گرفتار ہوں گے (اور عذاب میں کیوں گرفتار نہ ہوں کہ حق تعالیٰ کی نسبت بُری بُری باتیں بیان کرتے ہیں، حالانکہ) اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں (پس ان کافرانہ بیانات سے وہ گرفتارِ عذاب ہوں گے) مگر جو اللہ کے خاص (یعنی ایمان والے) بندے ہیں (وہ اس عذاب سے بچیں گے) سو تم اور تمہارے سارے معبود (سب مل کر بھی) خدا سے کسی کو پھیر نہیں سکتے (جیسی تم کوشش کیا کرتے ہو) مگر اسی کو جو کہ (علمِ الٰہی میں) جہنم رسید ہونے والا ہے اور (آگے ملائکہ کا ذکر فرماتے ہیں کہ ان میں جو ملائکہ ہیں اُن کا یہ مقولہ ہے کہ ہم تو بندۂ محض ہیں، چنانچہ جو خدمت ہمارے سپرد ہے اس میں) ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے (کہ اسی کی بجا آوری میں لگے رہتے ہیں، اپنی رائے سے کچھ نہیں کر سکتے) اور ہم (خدا کے حضور میں حکم سننے کے وقت یا عبادت کے وقت ادب سے) صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور ہم (خدا کی) پاکی بیان کرنے میں بھی لگے رہتے ہیں (غرض ہر طرح محکوم اور بندے ہیں۔ سو جب فرشتے خود اپنی بندگی کا اعتراف کر رہے ہیں تو پھر اُن پر معبود ہونے کا شبہ کرنا بڑی بیوقوفی ہے، پس جنات اور ملائکہ کے حق میں خدائی کا اعتقاد باحسنِ وجوہ باطل ہو گیا)

معارف ومسائل

انبیاء علیہم السلام کے واقعات نصیحت وعبرت کے لئے بیان کئے گئے تھے، اب پھر توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کا اصل مضمون بیان کیا جا رہا ہے، اور یہاں شرک کی ایک خاص قسم کا بیان ہے۔ کفارِ عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور جنات کی سردار زادیاں فرشتوں کی مائیں ہیں۔ بقول علامہ واحدیؒ یہ عقیدہ قریش کے علاوہ جہینہ، بنو سلمہ، بنو خزاعہ اور بنو ملیح کے یہاں بھی رائج تھا (تفسیر کبیر، ص ۱۱۲ ج ۷)

فَاسْتَفْتِهِمْ (الیٰ قولہ تعالیٰ) اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، ان آیتوں میں کفارِ عرب کے اسی عقیدے کی تردید کے لئے دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو تمہارا یہ عقیدہ خود تمہارے عرف اور رسم ورواج کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ تم بیٹیوں کو باعثِ ننگ سمجھتے ہو اب جو چیز تمہارے اپنے لئے ننگ وعار ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ پھر تم نے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا ہے، اس کی تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ کسی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے تین قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں۔ ایک مشاہدہ، دوسرے نقلی دلیل، یعنی کسی ایسی ذات کا قول جس کی سچائی مسلّم ہو، اور تیسرے عقلی دلیل۔ جہاں تک مشاہدہ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو فرشتوں کی تخلیق کرتے ہوئے دیکھا؟

نہیں جس سے فرشتوں کا مؤنث ہونا معلوم ہو سکتا، لہٰذا مشاہدہ کی کوئی دلیل تو تمھارے پاس ہو نہیں (اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ کا یہی مطلب ہے) اب رہی نقلی دلیل سو وہ بھی تمھارے پاس نہیں، اس لئے کہ قول اُن لوگوں کا معتبر ہوتا ہے جن کی سچائی مسلّم ہو، اس کے برخلاف جو لوگ اس عقیدے کے قائل ہیں وہ جھوٹے لوگ ہیں، اُن کی بات کوئی حجت نہیں ہو سکتی (اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ الخ کا یہی مطلب ہے) رہی عقلی دلیل، سو وہ بھی تمھاری تائید نہیں کرتی، اس لئے کہ خود تمھارے خیال کے مطابق بیٹیاں بیٹوں کے مقابلے میں کم رتبہ رکھتی ہیں، اب جو ذات تمام کائنات سے افضل ہے وہ اپنے لئے کم رتبہ والی چیز کو کیسے پسند کر سکتی ہے؟ (اَصْطَفَى الْبَنٰتِ عَلَى الْبَنِيْنَ کا یہی مطلب ہے) اب صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ تمھارے پاس کوئی آسمانی کتاب آئی ہو اور اس میں بذریعہ وحی تمھیں اس عقیدے کی تعلیم دی گئی ہو، سو اگر ایسا ہے تو دکھاؤ وہ وحی اور وہ کتاب کہاں ہے؟ (اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ، فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کا یہی مفہوم ہے)۔

ہٹ دھرمی کرنے والوں کے لئے الزامی جواب زیادہ مناسب ہے

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تُلے ہوئے ہوں ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے۔ الزامی جواب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کو خود انہی کے کسی دوسرے نظریہ کے ذریعہ باطل کیا جائے اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے، بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ بھی غلط ہوتا ہے، لیکن مخالف کو سمجھانے کے لئے اس سے کام لے لیا جاتا ہے۔ یہاں باری تعالیٰ نے اُن کے عقیدہ کی تردید کے لئے خود انہی کے اس نظریہ کو استعمال فرمایا ہے کہ بیٹیوں کا وجود باعثِ ننگ و عار ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بیٹیوں کا وجود باعثِ ننگ ہو، نہ یہ مطلب ہے کہ اگر وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے بجائے خدا کے بیٹے کہتے تو یہ درست ہوتا، بلکہ یہ ایک الزامی جواب ہے۔ جس کا مقصد خود انہی کے مزعومات سے ان کے عقیدے کی تردید کرنا ہے، ورنہ اس قسم کے عقائد کا حقیقی جواب وہی ہے جو قرآن کریم ہی میں کئی جگہ مذکور ہوا کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اور اُسے کسی اولاد کی نہ ضرورت ہے، اور نہ اس کی رفعتِ شان کے یہ مناسب ہے کہ اس کی اولاد ہو۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا، (اور انھوں نے اللہ تعالیٰ اور جنّات کے درمیان نسبی تعلق قرار دیا ہے) اس جملے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ یہ مشرکین عرب کے اس فاسد عقیدے کا بیان ہے کہ جنّات کی سردار زادیاں فرشتوں کی مائیں ہیں۔ گویا معاذ اللہ جنّات کی سردار زادیوں سے اللہ تعالیٰ کا زوجیت کا تعلق ہے، اور اسی تعلق کے نتیجے میں فرشتے

وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ ایک تفسیری روایت میں ہے کہ جب مشرکین عرب نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ ان کی ماں کون ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا کہ جنّات کی سردار زادیاں۔ (تفسیر ابن کثیر، ص ۲۳ ج ۴) ——— لیکن اس تفسیر پر یہ اشکال رہتا ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ اور جنّات کے درمیان نسبی تعلق کا ذکر ہے اور زوجیت کا تعلق نسبی نہیں ہوتا۔

اس لئے ایک دوسری تفسیر یہاں زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے جو حضرت ابن عباسؓ، حسن بصریؒ اور ضحاکؒ سے منقول ہے، اور وہ یہ کہ بعض اہل عرب کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ معاذ اللہ ابلیس اللہ تعالیٰ کا بھائی ہے، اللہ تعالیٰ خالقِ خیر ہے اور وہ خالقِ شر، یہاں اسی باطل عقیدے کی تردید کی گئی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیرؒ و قرطبیؒ و تفسیر کبیر)

وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ (اور جنّات کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ گرفتار ہوں گے) "وہ" سے مراد ایسے مشرکین بھی ہو سکتے ہیں جو جنّات اور شیاطین کو خدا کا ہمسر قرار دیتے تھے، اور خود جنّات بھی۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ جن شیاطین اور جنّات کو تم نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا رکھا ہے وہ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ آخرت میں ان کا بُرا حشر ہونے والا ہے، مثلاً ابلیس، کہ وہ اپنے انجامِ بد سے خوب واقف ہے، اب جو خود یہ یقین رکھتا ہو کہ مجھے مبتلائے عذاب ہونا ہے اُسے خدا کا ہمسر قرار دینا کتنی بڑی حماقت ہے۔

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا
اور یہ تو کہا کرتے تھے۔ اگر ہمارے پاس کچھ احوال ہوتا پہلے لوگوں کا تو ہم
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ
ہوتے بندے اللہ کے چنے ہوئے۔ سو اس سے منکر ہو گئے اب آگے جان لیں گے اور
لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾
پہلے ہو چکا ہمارا حکم اپنے بندوں کے حق میں جو کہ رسول ہیں۔ بیشک انہی کو مدد دی جاتی ہے۔
وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ
اور ہمارا لشکر جو ہے بیشک وہی غالب ہو۔ سو تو اُن سے پھر ایک وقت تک، اور ان کو دیکھتا رہ
فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ
کہ وہ آگے دیکھ لیں گے۔ کیا ہماری آفت کو جلد مانگتے ہیں، پھر جب اُترے گی

بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾

ان کے میدان میں تو بُری صبح ہوگی ڈرائے ہوؤں کی ، اور پھر آ اُن سے ایک وقت تک

وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾	
اور دیکھتا رہ اب آگے دیکھ لیں گے۔	

خُلاصۂ تفسیر

اور یہ لوگ (یعنی کفارِ عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے) کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت (کی کتاب) پہلے لوگوں (کی کتابوں) کے طور پر آتی (یعنی جیسے یہود و نصاریٰ کے پاس رسول اور کتابیں آئیں، اگر ہمارے لئے ایسا ہوتا) تو ہم اللہ کے خاص بندے ہوتے (یعنی اس کتاب کی تصدیق اور اس پر عمل کرتے، ان کی طرح تکذیب اور مخالفت نہ کرتے) پھر (جب وہ نصیحت کی کتاب رسول کے ذریعہ سے اُن کو پہونچی تو) یہ لوگ اس کا انکار کرنے لگے (اور اپنا وہ عہد توڑ دیا) سو (خیر) اب ان کو (اس کا انجام) معلوم ہوا جاتا ہے (چنانچہ مرتے ہی کفر کا انجام سامنے آگیا، اور بعض سزائیں موت سے پہلے بھی مل گئیں) اور (آگے حضورؐ کو تسلی ہے کہ گو اس وقت ان مخالفین کو کسی قدر شوکت حاصل ہے لیکن یہ چند روزہ ہے کیونکہ) ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے (یعنی لوحِ محفوظ ہی میں) مقرر ہو چکا ہے کہ بیشک وہی غالب کئے جاویں گے اور (ہمارا تو عام قاعدہ ہے کہ) ہمارا لشکر غالب رہتا ہے (جو رسولوں کے متبعین کو بھی شامل ہے، سو جب یہ بات ہے کہ آپ غالب آنے والے ہیں ہی) تو آپ (تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک (صبر کیجئے اور) ان (کی مخالفت اور ایذا رسانی) کا خیال نہ کیجئے اور (ذرا) اُن کو دیکھتے رہئے (یعنی ان کی حالت کا قدرے انتظار کیجئے) سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے (اس کا بھی وہی مطلب ہے جو فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ کا تھا کہ اُن کو مرنے کے بعد بھی اور مرنے سے پہلے بھی اللہ کی طرف سے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دھمکی پر وہ کہہ سکتے تھے اور اکثر وہ کہا بھی کرتے تھے کہ ایسا کب ہوگا؟ تو اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ کیا ہمارے عذاب کا تقاضا کر رہے ہیں، سو وہ (عذاب) جب اُن کے رُدرُو آنازل ہوگا، سو وہ دن ان لوگوں کا جن کو (پہلے سے) ڈرایا جا چکا تھا بہت ہی بُرا ہوگا کہ وہ عذاب ٹل نہ سکے گا) اور (جب یہ بات ہے کہ ان لوگوں پر عذاب واقع ہونے والا ہے تو) آپ (تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک (صبر کیجئے اور) ان (کی مخالفت اور ایذا رسانی) کا خیال نہ کیجئے اور (ذرا ان کی حالت کو)

دیکھتے رہئے (یعنی منتظر رہئے) سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے (یعنی آپؐ کو تو ہمارے کہنے سے یقین ہے ہی، آنکھوں سے دیکھ کر انھیں بھی یقین آجائے گا)۔

معارف و مسائل

اسلام کے بنیادی عقائد کو دلائل و شواہد سے ثابت کرنے کے بعد ان آیتوں میں کفار کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل تمنا کیا کرتے تھے کہ اللہ کا کوئی پیغمبر آئے تو یہ اس کی پیروی کریں، لیکن جب آپؐ تشریف لے آئے تو انھوں نے ضد اور عناد کا وطیرہ اختیار کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کی ایذا رسانیوں سے رنجیدہ نہ ہوں، عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ آپ غالب اور فتح یاب ہوں گے اور یہ مغلوب اور نشانۂ عذاب۔ آخرت میں تو اس کا مکمل مظاہرہ ہوگا ہی، دنیا میں بھی اللہ نے دکھا دیا کہ غزوۂ بدر سے لے کر فتح مکہ تک ہر جہاد میں اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ظفر مند کیا، اور آپؐ کے مخالفین ذلیل و خوار ہوئے۔

اللہ والوں کے غلبہ کا مطلب

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا (الی قولہ تعالیٰ) وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ، ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے یہ بات پہلے سے طے کر رکھی ہے کہ ہمارے خاص بندے یعنی پیغمبر ہی غالب ہوتے ہیں۔ اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کو دنیا میں غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معلوم پیغمبروں میں اکثریت تو ایسے ہی حضرات کی ہے جن کی قومیں انھیں جھٹلا کر عذاب میں مبتلا ہوئیں، اور ان حضرات کو عذاب سے محفوظ رکھا گیا صرف چند انبیاء علیہم السلام ایسے ہیں جنھیں دنیا میں آخر وقت تک بظاہر مادی طور پر غلبہ نہ مل سکا، لیکن دلیل و حجت کے میدان میں ہمیشہ وہی سربلند رہے، اور نظریاتی فتح ہمیشہ انہی کو حاصل ہوئی، ہاں اس سربلندی کے مادی آثار کسی خاص حکمت مثلاً آزمائش وغیرہ کی وجہ سے آخرت تک مؤخر کر دیئے گئے۔ لہٰذا بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ذلیل رہزن کسی بڑے حاکم افسر کے ساتھ سفر کی حالت میں لوٹ مار کرنے لگے، مگر وہ حاکم اپنی خداداد عالی دماغی کی وجہ سے ہرگز اس ذلیل رہزن کی خوشامد نہیں کرے گا حتیٰ کہ جب وہ حاکم اپنے دارالحکومت میں پہنچے گا اس رہزن کو گرفتار کر کے سزا دے گا۔ لہٰذا اس عارضی غلبہ کی وجہ سے نہ اُس رہزن کو حاکم کہہ سکتے ہیں، اور نہ اس افسر کو محکوم، بلکہ اصل حالت کے اعتبار سے وہ رہزن اس غلبہ میں بھی محکوم ہے، اور وہ افسر اس مغلوبیت میں بھی

حاکم ہے۔ اسی بات کو حضرت ابن عباسؓ نے ایک مختصر اور سلیس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے اِنْ تَنْصُرُوْهُ يُنْصَرُوْا فِي الدُّنْيَا وَيُنْصَرُوْا فِي الْاٰخِرَةِ (بیان القرآن تفسیر سورۃ مائدہ)

لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ غلبہ خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں، کسی قوم کو محض خصوصیات نسلی یا دین کے ساتھ محض نام کے تعلق سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو "اللہ کے لشکر" کا ایک فرد بنا لے۔ جس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں اللہ کی اطاعت کو اپنا مقصدِ حیات بنائے ہوئے ہو۔ یہاں "جُنْدَنَا" (ہمارا لشکر) کا لفظ بتا رہا ہے کہ جو شخص اسلام قبول کرے اُسے اپنی ساری زندگی نفس اور شیطان کی طاقتوں سے جنگ کرنے میں خرچ کرنے کا معاہدہ کرنا ہوگا اور اس کا غلبہ خواہ مادی ہو یا اخلاقی، دنیا میں ہو یا آخرت میں، اسی شرط پر موقوف ہے۔

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ، (پس جب وہ عذاب اُن کے صحن میں آنازل ہوگا تو جن لوگوں کو پہلے ڈرایا جاچکا تھا اُن کی وہ صبح بہت بُری ہوگی) ساحۃؓ کے لفظی معنی صحن کے ہیں، اور نزل بساحتہٖ (اس کے صحن میں اُترا) عربی محاورہ ہے، جس کا مفہوم کسی آفت کا سامنے آجانا ہے، اور صبح کے وقت کی تخصیص یہ ہے کہ اہلِ عرب میں دشمن کا حملہ عموماً اسی وقت ہوا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی یہی تھا کہ اگر کسی دشمن کے خطے میں رات کے وقت پہنچتے تو حملے کے لئے صبح تک انتظار فرماتے تھے (مظہری) روایات میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعۂ خیبر پر صبح کے وقت حملہ کیا تو ارشاد فرمایا "اللہ اکبر، خربت خیبر، انا اذا انزلنا بساحۃ قوم فساء صباح المنذرین (اللہ اکبر! خیبر ویران ہوگیا، بلاشبہ جب ہم کسی قوم کے صحن میں اترتے ہیں تو جن لوگوں کو پہلے ڈرایا جاچکا تھا اُن کی وہ صبح بہت بُری ہوتی ہے)۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى

پاک ذات ہے تیرے رب کی وہ پروردگار عزت والا پاک ہے اُن باتوں سے جو بیان کرتے ہیں، اور سلام ہے

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٢﴾

رسولوں پر، اور سب خوبی ہے اللہ تعالیٰ کو جو رب ہے سارے جہان کا۔

خُلاصۂ تفسیر

آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (کافر) بیان کرتے ہیں،

(پس خدا کو ان باتوں سے پاک ہی قرار دو) اور (پیغمبروں کو واجب الاتباع سمجھو، کیونکہ ہم انکی شان میں یہ کہتے ہیں کہ) سلام ہو پیغمبروں پر اور (خدا کو شرک وغیرہ سے پاک سمجھنے کے ساتھ تمام کمالات کا جامع بھی سمجھو کیونکہ) تمامتر خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار (اور مالک) ہے ؂

مَعارف ومَسائل

ان آیتوں پر سورۃ صافّات کو ختم کیا گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس حسین خاتمے کی تشریح کے لئے دفتر چاہئیں۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان تین مختصر آیتوں میں سورت کے جملہ مضامین کو سمیٹ دیا ہے۔ سورت کی ابتداء توحید کے بیان سے ہوئی تھی، جس کا حاصل یہ تھا کہ مشرکین جو جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں باری تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں اسی طویل مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد سورت میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کئے گئے تھے، چنانچہ دوسری آیت میں ان کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد کھول کھول کر کفار کے عقائد اور شبہات واعتراضات کی عقلی ونقلی تردید کرکے یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ غلبہ بالآخر اہلِ حق کو حاصل ہوگا، ان باتوں کو جو شخص بھی عقل وبصیرت کی نگاہ سے پڑھے گا وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء پر مجبور ہوگا، چنانچہ اسی حمد وثناء پر سورت کو ختم کیا گیا ہے۔

نیز ان آیتوں میں اسلام کے بنیادی عقائد توحید اور رسالت کا صراحۃً اور آخرت کا ضمناً ذکر بھی آگیا ہے جن کا اثبات سورت کا اصل مقصد تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ تعلیم بھی دیدی گئی ہے کہ ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے ہر مضمون، ہر خطبے اور ہر مجلس کا اختتام باری تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کی حمد وثناء پر کرے۔ چنانچہ علامہ قرطبیؒ نے یہاں اپنی سند سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی بار سُنا کہ آپ نماز ختم ہونے کے بعد یہ آیات تلاوت فرماتے تھے، سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ الخ (قرطبی)۔ ـــــ نیز متعدد تفاسیر میں امام بغویؒ کے حوالے سے حضرت علیؓ کا یہ قول منقول ہے کہ "جو شخص یہ چاہتا ہو کہ قیامت کے دن اسے بھرپور پیمانے سے اجر ملے اسے چاہئے کہ وہ اپنی ہر مجلس کے آخر میں یہ پڑھا کرے سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ تا آخر السورۃ" یہی قول ابن ابی حاتمؒ نے حضرت شعبیؒ کی روایت سے مرفوعاً بھی نقل کیا ہے (تفسیر ابن کثیر)

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بحمد اللہ تعالیٰ آج بتاریخ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۲ھ شب یکشنبہ بوقت عشاء سورۃ صافّات کی تفسیر مکمل ہوئی

؂